

اُشرون



واجبہ تنہم



اُترن

وَاحِدۂ تَبَسُّم



اور سینرک سنیٹر

۵۴ - جہو وے پارے اسکیم نارتھ لکن روڈ

جیسے ۵۸

جملہ حقوق محفوظ

سلسلہ مطبوعات نمبر ۳

طبع اول جنوری ۱۹۷۷ء

تعداد اشاعت ۲۰۰۰

قیمت: ۲۰ روپے

اپنے عزیز ترین دلیور

نازی کے نام

جو ۲۹ سال کی عمر میں ۲۴ مئی ۱۹۷۴ء کو جینے کی خواہش لئے ایک ٹرک کے حادثہ کا شکار ہو گیا

ناشر: اشفاق احمد

اور سینٹر بک سنٹر بمبئی ۵۸

طابع: سراج الدولہ

کتابت: شمس

مطبع: یونیورسٹی لیبوریٹری ۲۳ ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ

بائڈنگ: محمد ابرار

فہرست

۱۷	پیش بندھی	۱ -
۲۹	ناگن	۲ -
۴۱	لڑکی بازار	۳ -
۵۹	شادی	۴ -
۷۵	ذرا ہوراوپر	۵ -
۸۸	اترن	۶ -
۹۹	بھوک	۷ -
۱۱۴	لو لکھا بار	۸ -
۱۳۹	ستاگوشت	۹ -
۱۴۹	اللہ کے نام پر	۱۰ -
۱۶۴	بھوٹن	۱۱ -
۱۷۶	ٹھکانا	۱۲ -
۱۹۰	پانچواں مینار	۱۳ -
۲۱۰	نکرا لٹ	۱۴ -
۲۳۴	نصیبہ والی	۱۵ -

قوسِ خیال

”اترن“۔ میری، حیدرآبادی ماحول پر لکھی گئی کہانیوں کا مجموعہ

آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

کسی بھی لکھنے والے کو اس حد تک تو برداشت کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے پہلے مجموعے میں اپنے ذاتی حالات اور خیالات بیان کرے، لیکن ہر کتاب میں کہانیوں سے پہلے ایک لمبا چوڑا مضمون، دوا کی شیشی کی یاد دلاتا ہے جس میں ایک پرچہ ترکیب استعمال کے طور پر ملفوف ہوتا ہے۔ میں پیش لفظ لکھنے سے بہت کتراتی ہوں، میں نے صرف اپنی پہلی کتاب ”شہر ممنوع“ میں ایک بہت طویل مضمون، اپنے حالاتِ زندگی سے متعلق لکھا تھا اور یوں ہی نہیں لکھ دیا تھا وہ میری پہلی کتاب تھی اور لوگ میرے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ اور مجھے پڑھنے والوں کی خواہش کا احترام کرنا لازم تھا۔ اس کے بعد میری سات آٹھ کتابیں چھپیں۔ لیکن میں نے کچھ نہیں لکھا۔ لیکن اس بار بات کچھ اور ہے۔ یہ کہانیاں۔ حیدرآبادی ماحول پر لکھی ہوئی میری کہانیاں بیک وقت میری رسوائی

کاباعت بھی بنی ہیں اور میری قدردانی کا بھی —

قدردانی کا جہاں تک سوال ہے۔ اسے فی الوقت جانے دیجئے
کیونکہ اپنے منہ اپنی تعریف صرف مٹھو کرتے ہیں۔ اور میں اپنا شمار انسانوں
میں کرتی ہوں، جو صرف حقیقت کا اظہار کرنا پسند کرتے ہیں۔ رسوائی
کا بھی مجھے کوئی ایسا ڈر نہیں لیکن الزامات کی فہرست جب ضرورت
سے زیادہ لمبی ہو جائے تو قلم اٹھانا ضروری ہو جاتا ہے۔

”داجدہ نے حیدر آباد کی تہذیب کا مذاق اٹھایا ہے۔“

”داجدہ نے حیدر آبادی اور دکنی بولی کا غلط استعمال کیا ہے
پٹھاروں کی خاطر زیادہ — وہاں کی تہذیب اور کلچر کو اجاگر کرنے کی
خاطر کم۔ بہت کم“

”داجدہ نے نوابوں کے کردار دل سے ترلشے ہیں۔“

”داجدہ کے یہ افسانے شریف بہو بیٹیوں کے پڑھنے کے لائق

نہیں ہیں۔“

”داجدہ نے حیدر آباد کی پاکیزہ تہذیب کو آڑ بنا کر فحش نگاری
کی انتہا کر دی ہے۔“

داجدہ کو حیدر آباد دکن کے بارے میں خاک بھی معلومات

نہیں۔ پتہ نہیں کہاں کہاں کے خیالی پیکر ترلشے ہیں۔“

یہ اور ایسے ہی کتنے الزام —

اب ذرا میری بھی کچھ سنیئے — ہندوستان اور پاکستان

دو ٹکڑوں میں بٹے۔ لیکن میں کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ میرے دل

اور ذہن کے کچھ ٹکڑے تو میرے وطن امراوتی میں رہ گئے کچھ حیدرآباد دکن کو ہجرت کر گئے۔ میں نے حیدرآباد دکن میں چودہ برس کا بن باس بھیلہ۔ یہ بن باس جنگلوں میں ملا ہوتا تو شاید سیتا پھل اور رام پھل کھا کر زندگی گزار دیتی! لیکن یہ بن باس مجھے حیدرآباد دکن میں ودیعت کیا گیا تھا۔ جہاں میں نے ”زہر پھل“ کھا کھا کے بھی خود کو زندہ پایا۔ بارہ برس کی گڑیاں کھیلنے اور بے فکری سے غل غپاڑے مچانے کی عمر میں اچانک ہاتھوں میں ایسا جام جمشید تھا دیا جائے جس میں ضرر سکتے روتے آہیں بھرتے چہرے ہی نظر آتے ہوں تو دنیا پھر اتنی خوبصورت نظر نہیں آتی۔ ویسے تو زندگی نے پہلے بھی مجھ سے کوئی خوبصورت سلوک نہیں کیا تھا، ایک برس کی عمر میں ماں اور تین برس کی عمر میں باپ بھی ساتھ چھوڑ جائیں تو ایسی زندگی، زندگی کی تہمت سے زیادہ معنی نہیں رکھتی۔ لیکن حیدرآباد دکن پہنچ کر جب میں نے انسانوں ہی کا انسانوں سے ایسا ناروا اور نامنصفانہ سلوک دیکھا تو میں اپنی جگہ سہم کر رہ گئی۔ لیکن جیسا کہ قانون قدرت ہے کہ کوئی بھی بیج زمین میں ڈالا جائے تو وہ تبھی پھل نہیں دینے لگتا، میرے ذہن کی زمین میں بھی ان بیجوں کی بوائی ہوئی اور وقت آنے پر ان میں کو نیلیں بھی پھوٹیں، پھول پتے بھی آنے لگے اور اب پھل بھی آئے شروع ہوئے۔ یوں سمجھیے کہ یہ فصل کہیں ۲۸ سالوں میں جا کر بہا پر آئی ہے۔ جو لوگ مجھ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں نے حیدرآبادی نوابوں پر الزام لگائے ہیں۔ دل سے خیالی پیکر تراشے ہیں، انھیں بدنام کیا ہے، جا بے جا تہمتیں لگائی ہیں۔

اُن میں سے کتنے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے حیدر آباد دکن میں ایک سال بھی گزارا ہے۔ یا اگر ساری زندگی بھی گزاری ہے تو کیا آنکھیں کہیں رہن رکھ دی تھیں۔؟ میرے ساتھ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ میں اپنی آنکھوں کے ساتھ جیتی ہوں۔

قدرت کا ایک بڑا اٹل قانون یہ بھی ہے کہ ظلم کا پیمانہ جب بھر جاتا ہے تو اس کا ان دیکھا لگتا اس پیمانے کو اوندھا دیتا ہے۔ حیدر آباد دکن کی شاندار تاریخ کا دردناک المیہ میں نے ہی نہیں سمجھوں لے دیکھا ہے۔ لوگ اسے سیاسی روپ دیتے ہیں دیتے رہیں۔ میں اپنی زبان میں اسے آہوں کی لپیٹ کہتی ہوں، جس نے تاریخ کا نقشہ بدل دیا۔ لوگ مجھ سے یہ بھی کہتے ہیں کہ گرٹے مردے کیوں اکھاڑتی ہو۔ اور اس کا فائدہ کیا ہے؟

گرٹے مردے اکھاڑنے کا جہاں تک سوال ہے تو میں نہ لکھتی، کبھی کوئی اور لکھ دیتا۔! بہر حال زمین میں دفن خزانے تو نمودار ہوتے ہی ہیں۔ کبھی زرگل کی صورت، کبھی قلمی شہ پاروں کی صورت۔ نام بدل جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آج واحدہ تبسم نہ لکھتی کل کوئی اور لکھ دیتا۔ لیکن آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ ساری کہانیاں یوں ہی سوئی رہتی ہیں؟ کیا چمکی، زینب، صندل، صنوبر، آبرو، زیتون، اور گل چمن کی آہیں یوں ہی ادھر ہی ادھر خالی چلی جاتی ہیں۔؟

رہی فائدے کی بات تو وہ یہ ہے کہ نئی نسل کو پتہ تو چلے کہ ان کے بزرگوں کی کن زیادتیوں کی سزا وہ بھیل رہے ہیں۔ لوگوں کو میری

ان کہانیوں میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، مجھے کوئی نقصان نظر نہیں آتا۔ یہ میرا یقین ہے کہ دنیا میں ہر جرم، ہر گناہ روز اول سے ہوتا آیا ہے، ہوتا بھی رہے گا۔ لیکن پھر بھی ان کہانیوں کو پڑھ کر ظلم سہنے والوں کے دل میں اگر بغاوت کی ایک ہلکی سی لہر بھی تھکولائے لیتی ہے تو یہ میری معراج ہے۔ حضرت عمر فاروق کا قول ہے۔ ”ظلم کرنے والے سے زیادہ ظلم سہنے والا قصور وار ہوتا ہے۔“ میں نے یہ کہانیاں لکھ کر ظلم سہنے کے خلاف ایک جہاد کیا ہے۔

فحش نگاری کا الزام ہی مجھ پر سرسے سے غلط ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سلیقے اور پردہ داری کے ساتھ قلم سے ادا کر دیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم فحش نگاری کسے کہتے ہیں۔ ایک کہانی ”نو لکھا ہار“ سخت موردِ عتاب بنی۔ ایسی تو میری کئی کہانیاں تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ پرچے جلا دیئے گئے جن میں وہ چھپی تھیں۔ احتجاجی جلوس نکلے گئے۔ دفاتر کو آگ لگا دینے کی کوشش کی گئی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مجھے قتل کرنے کی دھمکیاں دی گئیں، لیکن ”نو لکھا ہار“ کی بعض پہیلیوں پر سخت غصہ اور غضب کا اظہار کرتے ہوئے مقدمے تک دائر کرنے کی کارروائی کی گئی۔ حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ، جن کا آج ہندستان سال مناتا ہے، جن کا مقدس اور مبارک نام زبان پر آتے ہی دل، عقیدت سے بھر جاتا ہے۔ انہی کی پہیلیاں اگر میں اپنی کہانی میں پیش کر دوں تو اس میں اس قدر داد دلا کیوں — ۹۹ اور جہاں تک مجھ پر حیدر آبادی اور دکنی زبان کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے، مذاق اڑانے

کا الزام ہے اس سے زیادہ بے تکی بات میں نے آج تک نہیں سنی ۔
 میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ خود ستائی کے جملہ حقوق میں نے
 طوطوں کے نام منتقل کر دیئے ہیں ۔ میں تو صرف اس حقیقت کا اظہار
 کروں گی کہ شگنہ سے لے کر آج دسمبر ۱۹۷۶ء تک کوئی بھی میرے
 سامنے آگریہ دعویٰ کرے کہ ہاں واجدہ تبسم نے اس جگہ دکنی بولی کا غلط
 استعمال کیا ہے ۔ یا اس جگہ حیدر آبادی زبان کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے
 تو میں اپنا قلم توڑ کر لکھنے سے توبہ کر لوں گی ۔ لیکن مجھے امید کیا
 یقین ہے کہ میرے سامنے کوئی یہ بات نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ میں نے
 اس بیٹھی اور رسیلی حیدر آبادی زبان کے ایسے ایسے پہلوؤں کو ڈھونڈ
 نکالا ہے جہاں شاید ہی بڑے سے بڑے ماہر اہل زبان کی بھی نظر گئی ہو
 حیدر آبادی زبان وہ واجدہ زبان ہے ۔ جس میں مخاطبت کی حد تک تذکیرانیت کی
 کوئی بھی تخصیص نہیں ۔ کسی بھی حویلی ، محل ، میں آپ چلے جلیئے ۔ مخاطب
 نواب صاحب ہوں یا بیگم پاشا ۔ انداز مخاطب دونوں ہی کے لئے
 یہ ہوگا ۔

”آپ اتنے صبو صبو کاں جارئے۔“

ولیسے عام اردو زبان میں نواب صاحب کے لئے یوں ہوتا

”آپ اتنی صبح صبح کہاں تشریف لے جارہے ہیں۔“

اور بیگم پاشا کے لئے ۔ ”آپ اتنی صبح صبح کہاں تشریف

لے جارہی ہیں۔“

انداز گفتگو کی ایک حیرت انگیز یکسانیت ملاحظہ کیجئے۔

شادی کی محفل ہے۔ نو این پاشا کنیزوں اور خواصوں پر چلا رہی ہیں

”اُجاڑ مٹی پڑ کو جاؤ، دولہن کب سے نہا کو بیٹھی، کوئی مہندی

بھی کھگائے کی نہیں۔“

اب ایک منظر دیکھئے جہاں میت پڑی ہوئی ہے۔ وہی انداز۔

”اُجاڑ مٹی پڑ کو جاؤ، غسالن آئی کی نہیں۔ ہو۔ وہ عطر

پھولاں منگائے کی نہیں۔“

شادی کی خوشی کی محفل ہوا موت کی غمی کی۔ بات شروع ہوگی

اُجاڑ مٹی پڑ کو جاؤ۔ سے۔“

اردو کی صحیح زبان۔ جو عام طور سے ہندستان بھر میں رائج

ہے اور بولی جاتی ہے۔، جہاں ایک مرد چائے پینے کے لئے وہی کہے

گا۔ جو عورت کہے گی۔ یعنی۔

”میں نے چائے پی لی۔“

اب سنئے حیدر آبادی زبان میں اسی ایک بات کو کتنے طریقوں

سے کہا جاسکتا ہے۔

(مرد کی زبان سے)

۱۔ میں چائے پی لیا

۲۔ میں نے چائے پی لیا

۳۔ میں چائے پیا

۴۔ ہم چائے پی لئے۔

۵۔ میں چائے پی کر بیٹھا۔
اور عورت یوں کہے گی۔

۱۔ میں چائے پی لی

۲۔ میں چائے پی لے کر بیٹھی

۳۔ میں چائے پی

۴۔ میں نے چائے پی لی (یہ دراصل عام رائج اردو ہو گئی، لیکن حیدرآباد میں گفتگو اگر عورت کر رہی ہے تو کھانے کو بھی یوں ہی کہے گی کہ ”میں نے کھانا کھالی۔ میں نے خط لکھ لی۔ میں نے دروازہ کھول دی۔“)

اگر عثمانیہ یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس فرسٹ کا تمغہ لینے والا، ایم۔ اے، پاس مرد بھی کسی لڑکی یا عورت سے بات کرے گا تو اس کا لہجہ اور انداز ایسا ہوگا جیسے مخاطب کوئی مرد ہے۔ حالانکہ گفتگو عورت سے ہو رہی ہے۔

”کل آپ وعدہ کر کے بھی نہیں آئے، میں آپ کا کتنا راستہ دیکھتا۔“

”آپ چوڑی دار پا جائے میں بہت اچھے لگے رہے۔“
”آپ اگر چوٹی نیٹس ڈال کر بال کھلے بھی رکھتے تو اچھے لگتے۔“
اب لڑکیوں کا انداز گفتگو (امراء کی بیٹیاں)۔ ملاحظہ کیجئے
”مما میں آج کانچ نیٹس جاڑوں گا۔“

”بابا جان میں غمیدی میں آپ سے ہلو سونے کے کرٹے یوں گا۔“

”اگے گل چمن بہری ہے کیا، میں کب سے بول رہا ہوں میرے
کو پانی نہانے کا ہے۔“

یہاں بیگماتی زبان اور باندیاتی ”زبان میں کبھی تو زمین آسمان
کا فرق ملے گا اور کبھی دونوں ایک ہی صف میں کھڑی نظر آئیں گی۔
حویلی کی مالکن بی پاشا اپنی نوکرائی کو پکار رہی ہیں۔
”اگے چھناں کدھر مر کو گئی۔ بہری ہو گئی کیا۔ کاناں پٹ ہو گئیں
کیا۔“

نوکرائی اپنی ساتھی نوکرائی (کنیز) کو اس کے عشق کی واردات
پر تنبیہ کر رہی ہے۔

”اگے چھناں اس کے پیچھے مت دوڑ، حلال حرام میں نیٹیں تیراں
بن کو بیٹھ جا ٹینگلی۔“

پھر کسی حویلی میں آپ اس طرح کی زبان بھی بی پاشا سے سن لیں گے
جو کوئی باندی کبھی نہیں کہے گی۔

”صدقے گئی میں حضور کے۔ اچھا ہوا تو الٹ کر، برا ہوا تو
بندہ کر۔ اجی آپ کاٹے کو ان کے بیچ میں پڑتیں۔ شادی کرتے
کرو، بولو نیٹیں کرتے مرد۔ اپنے کو کیا۔“

وہی بی پاشا جب کو سنے پر آئیں گی تو خواصوں اور باندیوں کو
یوں نوازیں گی۔

”ایتہ کاں مر گئی گے۔ اپنا کفن سیتی بیٹھی ہو ٹینگلی۔ جواب
کیوں نیٹیں دیتی۔ حلخ میں پلیگ کا پھوڑا پھوٹا کیا۔“

کیا حیدر آبادی زبان کی یہ باریکیاں کسی اور نے تلاش کی ہیں؟ میں
 حیدر آباد برسوں رہی، ان حویلیوں کے بیچ مہمان بن کر رہی —
 — جن نے بارے میں یہ سب کچھ لکھا ہے۔ اور دیکھ کر
 لکھا ہے، سن کر لکھا ہے۔ پھر میں کیسے یہ الزام صحیح مان لوں کہ میں نے
 خیالی پیکر تراشے ہیں۔ اگر میں جو ناگڑھ میں رہی ہوتی، رام پور میں
 رہی ہوتی، یا جے پور میں رہی ہوتی تو یقیناً وہاں کے حالات لکھتی پھر حیدر آباد
 کے نہ لکھتی، لیکن لوگوں کا جو کہنا ہے کہ میں حیدر آباد کے پیچھے ہٹا ہوا
 دھوکہ کر چڑ گئی ہوں تو ظاہر بات ہے کہ جن زمینوں اور آسمانوں
 کے بیچ میں رہی ہوں۔ انھیں کی داستانیں رقم بھی کروں گی۔
 اور یہ داستانیں اور افسانے میں نے اس لئے نہیں لکھے ہیں
 کہ لوگ انھیں پڑھ کر چٹخا رہے بھریں، واہ واہ کریں یا مجھے داد دیں۔
 میں نے تو انھیں کاغذ پر یوں منتقل کیا ہے کہ میں جانتی تھی کہ اگر میں نے
 انھیں صرف غلوں اور حویلیوں میں ہی رہنے دیا تو وہ ہمیشہ کے لئے وہیں
 دفن ہو کر رہ جائیں گے۔ اور یہ خزانے اگر وقت کی تہہ در تہہ گرد میں
 گم ہو کر مدفون ہو جاتے تو حالات کی تیز آندھی بھلے ہی "کھل جاسم سم" کا
 کتنا ہی درد کرتی رہتی وہ درجی وانہ ہوتے۔
 میرا سارا تصور یہ ہے کہ مجھے وہ منتشر یاد تھا جو بند دروازوں کو
 کھول دیتا ہے۔

میں نے یہ کہانیاں لوگوں کو خوشن کرنے، یا ناراض کرنے یا ناراض

کرنے کے لئے نہیں لکھی ہیں۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روشن پہلوؤں پر میں نے جو لکھا ہے۔ وہ آئسو پ کی کچھنے کی ایک کوشش ہے۔ یہ بات سرے سے غلط ہے۔ میں صرف ایک بات جانتی ہوں کہ میں نے تو بس آئینہ دکھایا ہے!۔ میں نے اپنے قلم کے ذریعہ ہمیشہ مظلوم طبقہ کا ساتھ دیا ہے۔ میری توجہ کا مستحق ہمیشہ اچھلا اور پسپا ہوا نچلا طبقہ رہا ہے، وہی نچلا طبقہ جو دراصل سب سے اہم ہوتا ہے، کسی بھی بلندی پر چڑھنے کے لئے سب سے پہلا قدم سب سے نچلی سیڑھی پر رکھا جاتا ہے۔ میں اس نچلی سیڑھی کی اہمیت کو جانتی اور مانتی ہوں۔ اور میری ساری ہمدردی ان آنکھوں کے ساتھ ہوتی ہے جو آئسو پ سے بھری ہوتی ہیں۔

مجھے بتایا گیا ہے، یہ احساس دلایا گیا ہے کہ ”آج سے اگر تم ایک لفظ بھی نہ لکھو تو بھی اردو ادب تمہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔“ حیدر آبادی ماحول پر لکھی گئی یہ تمہاری کہانیاں اردو ادب میں تمہاری یاد ہمیشہ قائم رکھیں گی۔ یہ تو لوگوں نے مجھے سنایا ہے۔

لیکن میں آپ سے بڑے اعتماد سے یہ کہوں گی کہ اردو ادب مجھے فراموش کرے یا نہ کرے یہ ساری کہانیاں آپ بھی فراموش نہیں کر پائیں گے!!

واجدہ تبسم
۲۶-۱۲-۷۶
بیبی

اُترن

(حیدرآبادی ماحول پر لکھی گئی کہانیاں)

(سن اشاعت: 1977)

واجدہ تبسم

پیش بندھی

دوہا میاں کے پانی نہانے کی تیاری کر لو گے چھو کر یاں ۔
 تما جانی کی آواز سنتے ہی دوہا میاں نواب ممتاز کے دل میں انار چھوٹنے
 لگے ۔

دوہن والوں کی حویلی سے باندیوں کی ایک پوری فوج کشتیاں سر پہ
 اٹھائے ابھی ابھی سرخ حویلی میں وارد ہوئی تھی ۔ ان کشتیوں میں ہزار ہاروے
 کا سامان لدا ہوا تھا ۔ کھانے پینے کے سامان کی توقیت ہی کیا ، یہی ہزار دو
 ہزار کار ہا ہو گا ۔ لیکن محض ریت رسم بھانے کی خاطر جو بیش قیمت ریوسا اور
 کپڑے دوہا میاں کے لئے آئے تھے ان کی لاگت کوئی جوڑنے بیٹھتا تو لاکھوں
 سے بھی اد پر ہمتی ۔ یہ کوئی بندھی ٹکی عام ریت تو تھی نہیں بس یہ تھا کہ نواب
 قدریار جنگ کے بزرگوں سے چلی آرہی تھی کہ جس دن دوہن اپنے گھر مایوں ،

بیٹھتی، دولہا کے لئے بھی زرد جوڑا، مسٹھائیاں اور زیور بھجوائے جلتے۔
 زیور کا تو نام ہی تھا۔ بس ایک موتی کاست لڑا ہوتا۔ لیکن قیمت میں یہ ایک
 زیور ہی ہزاروں زیوروں پر بھاری ہوتا۔ جوڑا ایسا ہی ہوتا جیسا نواب
 لوگوں کے گھروں میں پہنا جاتا۔ ساٹن یا سل سل کرتی شامو کا تنگٹ جامہ
 اعلیٰ ریشم کا بند گلے کا کرتا، حیدر آبادی اور پچی دیوار کی ٹوپی اور زر کا شیر دانی
 یہ نواب ممتاز کے لئے جو شیر دانی آئی تھی، اس میں سیکڑوں پوسے کے سچے موتی
 ٹنگے ہوئے تھے۔ لیکن اس وقت جو نواب ممتاز کے دل میں چراغاں ہو
 رہا تھا تو اس لئے نہیں کہ ان کے لئے لاکھوں کا پہنا ما آیا تھا، یا وہ سونے
 سے پیلے اور موتیوں سے اُجلے ہونے والے تھے۔ بلکہ ان کے اندر باہر ساری
 اُتھل پُتھل ترویوں مچی ہوئی تھی کہ اب ان کے نہلانے کے سامان ہوسکتے
 اور محل کی یہ ریت تھی کہ دولہا مانجھے بیٹھنے کے لئے کبھی اپنے ہاتھوں نہ نہاتا، بلکہ
 دولہن کے گھر سے آئی ہوئی چھوکریاں، سائیاں، رشتے کی ساری لڑکیاں اینٹلی
 پیلی نوکرا بنیاں یہ مبارک نرض انجام دیتی۔ بھٹی عمر بھر تو آدمی لپسنے ہاتھوں
 نہاتا ہی ہے۔ یہ کوئی اس تپاٹے ہوئے جسم سے پوچھے جسے بیک وقت
 کئی کئی کنوارے ہاتھوں کی ٹھنڈک نصیب ہونے والی ہو۔

اور اصل میں تو یہ بھی بات نہیں تھی کہ نواب ممتاز محض چھوکر یوں
 کے ہاتھوں نہانے کے لشے کی لذت کو مرے جا رہے ہوں وہ تو وقت
 ہی دوسرا تھا۔

اخصیہ معلوم تھا کہ آج چھوکر یوں کی اس فوج میں وہ پیش نبی
 ہی آئی ہوئی تھی جو ان کی دواہن کا کام کرنے، اس کی پیشی میں سدا بندھی

رہنے کے لئے جہیز میں دی جانے والی ہے۔ افوہ یہ بھی کیا مزہ دار سلسلہ
 تھا! دولہا میاں کے تو وارے نیارے ہو جاتے۔ اس رواج کا سرا کہاں
 جا کر ملتا تھا پتہ نہیں۔ نیکن حیدر آباد کے اس مشہور نوابی گھرانے میں ایک
 بار ایسا ہوا کہ ایک بیٹا نے جنم لیا تو ایسی صورت تھی مالتو بندریا: بچپن تو جو
 توں کر کے کٹ گیا، اصل مصیبت جو الی آنے کے بعد آئی۔ پڑھ لکھ بھی
 کئی تھیں تو کیا ہو ایسی صورت کون گلے لگاتا؟ لڑکی دیکھنے والے ہٹے تو
 مصیبت کی ماری ماں نے بیٹی کی جگہ ایک چاند کا ٹکڑا بٹھا دیا۔ دولہا والے
 دیکھتے ہی ٹوٹ ہو گئے۔ آدنی یہ تھی کہ شادی کے دن جو آری مصوف
 اور جلوہ نمائی ہوتی ہے اس سے کیسے نمٹا جاتا؟ اس کا حل یہ نکالا گیا
 کہ ٹھیک اسی لمحے جب آئینے میں صورت دکھائی جانے والی تھی۔ دلہن
 کو سوچے سمجھے پیر گرام کے مطابق سخت زردار پکڑ لاد دیا گیا۔ مونہہ پیٹے
 سرخ گھونگھٹ میں دلہن وہیں ڈھیر ہو گئی۔ سب ریتوں رسموں سے
 فارغ ہونے کے بعد جب دلہن کو اس کمرے میں پہنچایا گیا اور پیچھے پیچھے دولہا
 میاں بھی شب بھری کے لئے شرطے بھینپتے وارد ہوئے تو داخل ہوتے ہوتے
 انہیں ایسا لگا کہ اصل چاند تو دروازے کی اوٹ سے طلوع ہو رہا ہے۔
 گوشت کی بو پا کر شیر لپکتا ہی ہے۔ یہ کون سی نئی بات ہے؟ دولہا میاں
 ذرا ٹھٹھکے جھپکے اور رک گئے۔ مگر وہ نہ ٹھٹھکی نہ جھپکی، مزے میں کھڑی مسکرا
 مسکرا کر اکھیں پر چاتی رہی کہ اس مسکراہٹ کے صلے میں اس کے ماں باپ
 کا منہ پہلے ہی چاندی سے بھر دیا گیا تھا۔ لوگ میٹھے کی لالچ میں جھوٹا کھاتے
 ہیں۔ دولہا میاں نے پہلے میٹھے سے کی، بعد کو جھوٹا کھانا پڑے تو جوتی سے

اس وقت تو تر مال سامنے تھا!

بعد میں سسرال والوں نے بڑی لے دے چائی کہ کون سی لڑکی بتائی،
کون سی بیاہ دی، لیکن دو لہامیاں ایسے شریف تھے کہ کبھی بے چاروں نے
گلہ نہ کیا۔ کہہ دیا میری قسمت میں جو تھا میرے کو مل گیا۔ اب میرے کو کسی
سے خطی کوئی گلہ نہیں۔" اور پھر پورے حیدرآباد میں یہ ریت ہی پڑ گئی کہ
جہیز میں دو لہن کے کام کاج کی خاطر کوئی طرح دار سی لونڈیا ساتھ کر دی جاوے
جو ہر دم دو لہن کی پیشی میں بندھی رہے۔ دو لہن کے کام کا تو بس نام ہوتا "اصل
کام" تو دو لہا کا ہوتا۔

حویلی میں جب بھی کسی شادی کی تمام جھام پتی سارے لڑکوں میں رتہ کشی
ہوتی رہتی کہ دیکھیں اس کے نصیب میں اب کے کون سی پری جمال نکھی ہوئی ہے
ایسا بھی بار بار ہوتا کہ شریف لڑکے نظر اٹھا کر بیش بندھی کو دیکھتے تک نہ تھے۔
انہیں جو کچھ بھی مطلب ہوتا اپنی بیاہی دو لہن سے ہی ہوتا۔ لیکن ایسے پارسا
تھے کتنے؟ اور جو ایسے پارسا ہوتے بھی تو انہیں دوستوں کے طعنے سننے پڑتے
"یا تم میں کچھ کمی معلوم پڑتی ہے۔ نہیں تو یہ کیا بات ہے کہ شیرینی تمہارے ہونٹوں
کے اترتے خریب، جو رتم ہونٹاں چاٹتے تک نہیں؟"

مرد سب کچھ سہہ سکتا ہے مردانگی پر طعن نہیں سہہ سکتا۔
اور فواہ ہوتا بھی انہیں میں سے تھے جو ٹھنڈے پانی کی تلیا میں ٹپکی
لگا دینے کو سعادت سمجھتے ہیں۔

ایک دم رشتے کی بہنوں، سایوں کا پرے کا پرا دوڑتا آیا اور ان کا

ہاتھ زور سے پکڑ لیا گیا۔
 ”اللہ ممتاز کھائی چلوں گا۔ آپ کو پانی نہلا کر مٹا جاتی سے ننگ
 منگیں گے۔“

گھسٹے ہوئے وہ لڑکیوں کے ہجوم میں کھینچے چلے گئے ”مائیوں نہلائی کی
 رسم بند حجاموں میں نہیں، ڈنکے کی چوٹ کھلے آنگن میں آسمان تلے ہوتی ہے
 جہاں چار سہاگن بیبیاں زرکار شامیلانے کی ڈوریاں پکڑ کر چاروں طرف کھڑی
 ہو جاتی ہیں۔ پانچویں سہاگن پہلے دودھ سے سر دھلاتی ہے اور پھر ساری لڑکیاں
 دولہا پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔“

”غم یہ ہے کہ نامراد شادی زندگی میں ایک بار ہوتی ہے۔“
 نواب ممتاز نے دل میں سوچا اور لڑکیوں بالیوں کی سرسراہٹ انگلیوں کی
 بے پناہ گدگدی سے جسم چرلنے لگے۔

”اگے اے گل چین گدگدی کیوں کر رہی گے؟ دکھتا نہیں کیا دولہا میاں
 کو برابر سے بیٹھنا بھی نہیں آریا۔“ ایک شریر سی لڑکی نے چہتے ہوئے ہلچے میں
 مسکرا کر اس لڑکی سے کہا جو نواب ممتاز کی پیٹھ پر کلیاں بکھیر رہی تھی۔

وہ چین سے ہنس پڑی

نواب ممتاز نے ذرا سا پلٹ کر دیکھا ہی تھا کہ انھیں ایسا لگا کہ وہ جادو
 کے اثر سے پتھر ہو گئے ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اب پیٹھ سے ہوتے ہوئے
 وہ موسیقی بھری انگلیاں ان کے شانوں سے ہوتی ہوئی پنچوں کی طرف آرہی ہیں
 اٹن اور مہکتے مسالے کی جی لوٹ پلوٹ کر دینے والی خوشبو میں ڈوبتے ڈوبتے
 ابھر کر انھوں نے دیکھا۔ لمبی لمبی کا فوری انگلیاں جن کے سروں پر ناخنوں

کی بجائے یا قوت ٹٹکے ہوئے تھے۔ دھیرے دھیرے ان کے حواس پر گریہ ہی ہیں۔

گل چمن — ؟ انہیں یاد آیا، یہی نام تھا، یہی پکار تھی جو اتنے دن سے ان کے کانوں میں پڑ رہی تھی کہ دہن کے ساتھ گل چمن پیش بندھی آرہی ہے اب پیٹھ سے فارغ ہو کر وہ سامنے آگئی تھی — پیر دھلانے وہ سامنے آئی تو نواب ممتاز اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔

کم بخت کمر تھی یا وہم؟

انہوں نے دل ہی دل میں شہادت کی انگلی سے انگوٹھا ملا کر گول بھٹا سا بنایا اور پھر خود ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ ادھوں! یہ چھلکا بڑا پڑے گا۔ کمر تو اس سے بھی تیلی ہے نامراد کی۔

وہ بڑے انہماک سے رگڑ رگڑ کر پیر دھلائے جا رہی تھی۔ گھنے بالوں کے گچھے پیشانی پر جھول رہے تھے۔ گہرے رنگ تپ کر سرخی مائل ہو رہا تھا۔ کمر تا خدا کا شکر ہے بند گٹے کا تھا، مگر پھر بھی صاف ظاہر تھا کہ اندر جو بھی تھا اپنے آپ میں نہیں تھا۔ ابھر آنے پر کمر بستہ تھا اور یہ ساری دھاندلی پیٹ کی پستنیوں کی تھی۔ نہ پیٹ ایسا چپاتی ہوتا نہ ابھاریوں نمایاں ہوتے۔ اسی دم پیچھے سے کوئی پکارا: ایو یہ گل چمن کدھر مر گئی۔ اس کا چھو کر روتا رہا ہے۔

چھو کر — ؟ نواب ممتاز نے دل ہی دل میں سوچا۔ پھر وہ خوش ہو گئے۔ بہت سے لوگ کچے پھل کے شوقین ہوتے ہیں۔ نامرادوں کو پتہ ہی نہیں کہ پکا ہوا پھل کیا چیز ہوتی ہے! ارے کچے پھل میں وہ بات کہاں جو

پکے ہوئے دس وار پھل میں ہوتی ہے۔ ذرا ہاتھ لگاؤ اور ٹپ سے جھولی ہیں
پانچویں دن شادی تھی۔

ماہوں سے لے کر شادی تک کے پانچ دن ممتاز نواب نے کیسے گزارے
اس کا پتہ صرف ان کے اپنے دل کو تھا۔ ان کی تو دہن بھی بڑی خوبصورت
اور نازک، کانچ کی گڑیا سی تھیں۔ لیکن وہ کمر جو جانے تھی یا نہیں، ان کے
وجود کو تہہ دہلا کر گئی تھی۔ وہ سنسی جو چھین کر کے ان کے حواس پر گیری تھی، وہ رنگ
دہی رنگ جو جنت سے آدم کے اخراج کا باعث بنا تھا۔ وہی داد گندم
کا رنگ جو تپ تپ کر سونا بن گیا تھا اٹھیں رہ رہ کر لٹکا رہا تھا۔ ”کھا کر
دیکھو، کیسا نشہ آتا ہے!“

کیسی عجیب بات تھی۔ ایسا کھنورا جو زندگی بھر کلی کلی کارس چوستا ہا
ایک ایسی کلی کے پیچھے دیوانہ ہو رہا تھا جو ”مونہ بند“ تھی بھی نہیں۔

شادی کی ریت رسمیں ختم ہوتے ہی میں نہ آتی تھیں۔ اور ادھر نواب
ممتاز ضبط ک حدوں سے گزرے جا رہے تھے۔ جی تو کہتا تھا یہ سہرا دوپہر اٹھا
کر پھینکو اور ایک ہی ٹھما کے میں گود میں پیش بندھی کہ بھر کر کسی کو نے کھڑے
میں جاؤ بکو، لیکن ڈیوڑھی کی رسمیں رسمیں۔ اللہ اللہ!

ساری فضول رسموں سے فراغت ہو گئی تو دو لہا نواب نے اپنی کھا جرح
کو بلا کر رازداری سے کہا۔ ”کھا بی جان میں آپ کو جتاٹے شے رہا ہوں کہ اگر
کوئی نے بھی میرے کمرے میں جھانکا تو میں صبح اس کا کھوپڑا پھوڑ دیوں گا۔“

نئے دہن دو کہا کے کمرے میں تاکنے جھانکنے کا سلسلہ بے حد عام
تھا بے چارے بھولے اور شریف ختم کے لڑکے تو یہ بات جانتے بھی نہ تھے۔

اس لئے بُرے پھنستے۔ صبح کو ان کی وہ سنہری اڑائی جاتی کہ پھر دہن کے کمرے کی طرف قدم اٹھانے کی بھی ہمت نہ ہوتی۔ جو جہاں دیدہ ہوتے وہ دروازوں کی بھریوں پر کاغذ چپکا کر نچنت ہو جاتے۔ بات بھی کرتے تو سرگوشیوں میں اور جو اتاری ہوتے تو ان کے بوسوں کی پٹاپٹ بھی چار کمرے دو تک سنائی دیتی اور اس کا بھگستان بھی وہ دوسرے دن بھگت لیتے۔

ممتاز نواب چاروں کھونٹ جو کس تھے وہ ہر طرح اپنا انتظام پورا کر چکے تھے۔ آخر دوسروں سے گزرنا تھا غافل کیسے ہوتے؟

بھابی جان سنسیں اور شوخی سے بولیں "میں تو کسی کو آنے نہ دیوں گی۔ مگر تنہائی کا اتنا بھی نا جائز فائدہ نکوٹا کھاؤ کہ صبح کو بے چاری دہن کو اٹھنا بھی نہ آئے۔"

"دہن کو؟" نواب ممتاز دل ہی دل میں ہنس دئے۔

دہن کی سیج مٹا جانی والے کمرے سے ہٹ کر برا کمرہ جو تھا اس میں بجائی گئی تھی۔ دہن کے کمرے میں داخل ہونے پہلے ایک اور کمرہ شمارہ داری تھی۔ اسی راہ داری میں پیش بندھی کو رہنا تھا کہ دہن کو کام و نام پڑے تو زیادہ دوری نہ رہے۔ لیکن اتنا زیادہ نزدیک بھی نہیں کہ دو لہا دہن کی بات چیت بھی پیش بندھی سن لے۔ ایک دروازہ دہن کے کمرے میں تو تھا ہی، ایک راہ داری کا کمرہ بنا۔ جو تھا اس میں بھی تھا۔ اور یہی دراصل نواب ممتاز کے ارمانوں کی سیج تھی ساری لڑکیوں، بالیوں، میراثنوں، اور کلڑ بازوں کو پیچھے چھوڑ کر نواب ممتاز راہ داری میں داخل ہوئے اور دروازہ بند کر لیا۔

اس نے ایک پلنگڑی پر وہی گل چین مسکراتی ہوئی بیٹھی تھی جو سارے

گلوں اور چمنوں کا بچوڑ تھی۔ دوسکراتے ہوئے ہونٹ — جیسے رس بھرے
سنہرے آم کی اوپر تلے دو قاشیں رکھی ہوں اور کہتی ہوں، ”یو اور چوس ڈالو“
ہونٹوں کا صحیح مصروف تو آج ہی نواب کی سمجھ میں آیا۔ وہ جو پانچ دن سے
تڑپ رہے تھے۔ اور یہ سوچے ہوئے تھے کہ ایک دم ٹوٹ ہی پڑیں گے۔ قدرت
کی اس صنّاعی کو حیران حیران کھڑے دیکھتے رہے۔ چونکے تو اس وقت
جب ان کے کانوں نے یہ سنا: ”کپڑے اتار دیوں؟“

نواب متنازعہ بولا گئے۔ ”کپڑے اتار دیوں؟“ وہ جو زندگی بھر نرالا
لڑکیوں کے کپڑے تار تار کرتے آئے تھے۔ اس لبظا ہر آسان سے سوال سے
سٹ پٹا گئے۔ وہ سوال جو ان کی ملکیت کر رہی تھی۔

”کیوں؟“ ایک عجیب احمقانہ سوال ان کی زبان سے نکلا۔

وہ ہنسی — اس قدر بے باکی سے ہنسی کہ ان کے اندر کامر و بیدار
ہو گیا۔ ”کپڑے کاٹیکو اتار کرتے ہیں نواب صاحب — آپ نا تا بھی نیٹیں
معلوم؟“

اکھنوں نے پاگلوں کی طرح دہن کے دروازے کی کنڈی باہر سے چڑھائی
اور پیش بندھی پر ٹوٹ پڑے۔

جب ہونٹ چاٹتے ہوئے وہ اس عارضی کسب سے اٹھے تو خوش ہو کر
اکھنوں نے بٹوہ کھولا اور کھن کھن کرتے بیس روپے اس کی لرزتی ہوئی ننگی ہتھیلی
پر دکھائیے۔

وہ ابھی تک اسی جوڑے میں ملبوس تھی جو عورت نے دنیا میں پہلا
قدم رکھتے ہوئے پہنا تھا۔ لیکن روپے پانے کی خوشی میں اپنی برہنگی سے بے خبر

وہ کھٹ سے اٹھ بیٹھی۔ ایک، دو تین چار، پانچ کر کے اس نے اسی دم سارے روپے گن ڈالے۔ اور نواب جو اتنی دیر میں ذرا آگے جا چکے تھے۔ جا کر انھیں جھنجھوڑتی ہوئی بولی۔ یہ روپے۔ یہ ہیں روپے آپ میرے کو دئے؟

نواب دھیرے دھیرے پھر بٹ آئے۔ مسکرا کر کہا، "ہاں" وہ اسی دیوانگی بھری خوشی سے بولی "صرف ایک بار کے واسطے؟" نواب نے ہاں میں سر ہلایا تو وہ نجات سے ان کا ہاتھ پکڑ کر بولی، "تو ایک بار ہو۔۔۔ بس ایک بار ہو۔ وہ گڑ گڑائی۔

نواب ممتاز نے غور سے اسے دیکھا وہ پتہ نہیں کیا سمجھی۔ پھر گڑ گڑا کر بولی۔ "بچے کو تو میں افیون کھلا کر سلا دی ہوں۔ وہ ہرگز نیٹس اٹھنے والا۔ آپ کو خشم ہے۔ بیس روپے بہت ہوتے، نواب صاحب یہ تو میرے سال بھر کا خرچہ ہے۔ میرا مرد کتنا خوش نہیں ہوئیں گا۔!" تیرا مرد؟ نواب ممتاز ہٹھک گئے۔

ہو نواب صاحب وہ دہن بی کی حویلی میں دربان ہے۔ مگر کتنی کم تنخواہ ہے کہ ہمارے بچے کو دودھ ملتا ناہم کو چاول۔ یہ بیس روپے تو نواب صاحب سال بھر سے زیادہ چلیں گے۔"

نواب صاحب نے ابھی ابھی جو شر پیا تھا سر سر کر کے سارے سارا اتر گیا۔ انھیں اپنے حلق میں کھاری پن کا احساس ہوا۔ کیا آنسوؤں سے ان کا حلق تر ہو رہا تھا۔؟ انہوں نے رکتے ڈوبتے لمبے میں پیش بندھی سے پوچھا۔ "تیرے میاں کو معلوم ہے کہ آج مات تو کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے؟"

”معلوم؟ اجی نواب صاحب اس نے تو خوشی خوشی یہ بول کو میرے کو بھیجا تھا کہ نواب صاحب کو ضرور خوش کرنا۔ وہ پانچ روپے سے کم نہیں دیں گے مگر آپ تو.....“ اور مارے خوشی اور احسان مندی کے اس کی آواز گھٹ سی گئی۔

نواب صاحب خاموش ہو گئے۔ صدیوں کی خاندانی جیسے ان کے وجود پر چھا گئی۔ وہ کہے جا رہی تھی۔ ”آپ کو نہیں معلوم نواب صاحب پیش بندھی بننا کتنی خوش قسمتی کی بات ہے۔ مگر ایک بات ضرور ہے کہ دو ہا میاں آپ کا سادل والا بھی ہو۔۔۔“

تو پڑھی لکھی بھی ہے؟“ نواب صاحب پاتال میں سے بولے
 ”پڑھی لکھی؟“ وہ ذرا طنز سے ہنسی۔ ”ہاں اتنی پڑھی لکھی تو ہوں جو یہ جان پاؤں کہ چاند چمکتا بھی ہے تو ہم غریبوں کے گھروں میں اندھیرا ہی رہتا ہے ہو یہ کی روپیہ۔“ اس نے ایک کھن کھناتا روپیہ نکال کر نواب ممتاز کو دکھایا یہ روپیہ جو ہے اس میں چاند اور سورج سے بھی زیادہ چمک ہوتی ہے۔۔۔“
 نواب ممتاز پتھر بنے سن رہے تھے۔ وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ ”پیش بندھی بننا کتنا بڑا ہے نواب صاحب۔ آپ یہ سوچو کی میں اتنی شرمیلی لڑکی ہوں کہ اپنے میاں کو چراغ بجھاؤں سو اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتی مگر پیسہ۔۔۔ یہ پیسہ۔۔۔“ اس نے بیسوں کے بیس روپے کھن کھن کر کے فرش پر پٹخ دیئے۔ ”اس پیسے کے مارے میں اپنے سارے کپڑے آپ اتار دی کہ آپ کو پرچالیں، نہیں تو آپ یوں ہی چلے جلتے اور یہ تو میری آمدنی کی رات تھی۔ پیسے کے واسطے بے شرم بننا اچ پڑتا ہے نواب صاحب۔“

نواب ممتاز نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے گلے سے موتیوں کا ست لٹا
 اتارا اور اس کے پیروں میں ڈھیر کرتے ہوئے بولے "تو اسی دخت اپنے
 میاں کے پاس چلی جا۔ الفاظ آنسوؤں کے بوجھ سے ان کے گلے میں ٹوٹ
 پڑے تھے۔ "شائد یہ تیری زندگی بھر کو کافی ہو جائیں گا۔ بہت شیمتہ ہار ہے۔"
 اس نے ہار اٹھا کر نواب صاحب کے گلے میں ڈال دیا۔ اور ٹوٹے ٹوٹے
 لفظوں سے بولنے لگی۔ "یہ ہار تو میرے کو اکیلی کو زندگی بھر کو کافی ہو جائیں گا۔
 مگر حیدر آباد میں کتنی ساری غریب چھوکریاں ہیں نواب صاحب، جن کو کبھی نہ
 کبھی تو پیٹ کے واسطے پیش بندھی بن کر، پیسہ کمانے کو دوہوں کو پر چانا ہو
 سبج سجانا پڑیں گا۔ نواب صاحب آپ بڑے آدمی ہیں، آپ میرے کو آج
 یہ وعدہ دیو کی حیدر آباد سے اس لعنت کو آپ ختم کر کے اچ دم لیں گے
 دلہن کے واسطے کام کاج کے واسطے جائیں گی بھی تو کوئی بدھی عورت۔
 میرے ایسی جوان لڑکی نیٹ جس کے دل میں پیار تو اس کے میاں کے واسطے
 ہو، ہر جسم دوہوں کے سبج پو۔"

میں اکیلا۔ حیدر آباد آتا بڑا۔ میں کیسے اس خبیث ریت کو توڑ
 سکوں گا گل چمن،؟ "نواب ممتاز کے ہلچے میں گہرے دکھ اور کرب کی
 چھاپ تھی۔

وہ بڑے اعتماد سے بولی "آپ کو اتنا بھی نیٹ معلوم نواب صاحب
 کی گھول اندھیرے میں روشنی پھیلانے کا ایک چراغ اچ بھوت ہوتا۔
 نواب ممتاز نے غور سے اس حوصلہ مند لڑکی کو دیکھا جو انھیں اندھیر
 سے روشنیوں کی طرف بلاتی تھی۔ ان کی سوچتی ہوئی آنسو بھری آنکھوں نے
 ایک فیصلہ کر لیا اور انھوں نے اپنے سر سے زرد تارہ دار کمر اس کے برہنہ جسم پر ڈال دیا

ناگن

”ایو پاشا - جلدی سے پردہ کر لیو - بڑے سرکار ادرچ آرہیں۔“
مغلانی بی کی چھو کری کریمین کی آواز سنتے ہی مہر آراء ایک دم زنان خانے کی طرف
لپکی۔

خوئی میں بے حد پیاری اور حواس گم کر دینے والی شام کا افتتاح ہو رہا
تھا۔ خواجہ سرفا نوسوں میں رکھی ہوئی شمعیں روشن کرتا اور آواز ہر آواز تھا۔
مالن موتیا کی مست کر دینے والی خوشبو سے لڑے تازہ کھلے پھولوں کے گجرے
سب کے کمروں میں رکھتی پھر رہی تھی۔ پرکی طرف صحن میں کاتھارنے خس کی جھاڑو
سے آنجن صاف کر کے گلاب اور جبنر کے پانی سے چھڑکاؤ کرنا شروع کر دیا تھا
مہر آراء گرما کی شام کو صندل کے پانی سے غسل کر کے حمام سے نکلی ہی تھی۔ ابھی
جوان جسم کی مہک صندل سے پوچھ رہی تھی کہ تم زیادہ تو بہ شکن ہو یا میں؟

کہ کرین کی آواز نے اسے بولا دیا۔ لائے لائے بالوں میں سے ابھی موتی ٹوٹ
 ٹوٹ کر بکھری رہے تھے، ابٹن کی خوشبو ابھی حسین سراپا کے گرد طواف
 کر رہی رہی تھی، حسین آنکھوں میں جو پہلے ہی کم قاتل نہ تھیں۔ سیکا کاٹی پڑ جائے
 گلابی ڈھسے گھرے ہو کر قتل عام کی دعوت دے رہے تھے کہ کرین کی آواز آئی
 اور آواز بھی کیا کہ بڑے سرکار ادرپچ آئیں۔ اس نے سوچا "ہائے انوں
 اگر مجھے اس نڈاز میں دیکھ لیں تو۔۔۔ انوں تو آگے پچ ہزار بار تاک جھانک
 کمرے کو بیٹھے ہیں۔ ایسے میں تو اماں نی بھی گھر سے باہر ہیں۔"

اس نے بے حد سہم کر یہ سب سوچا ضرور، مگر قریب ہوتی ہوئی رات
 نے، حواس چھین لینے والی غیر موٹیا صندل اور ابٹن کی خوشبو نے کچے آنگن
 کی عطر گل کی مہک لے، گٹلے پانی والے غسل کی حیات بخش لذت نے
 اور تین سال سے خود اس کے اپنے ترپتے ترپاتے ارمانوں نے یہ بھی سوچا۔
 ایسی حسین شام کو اگر مجھے وہ ایک ہی بار قریب کر لیں تو؟

پتہ نہیں اس کے خیالوں نے بڑے سرکار کو آواز دی تھی یا انھیں بھی خوشبو
 نے بڑھا دیا تھا۔ یا تنہائی اور بے پناہ تنہائی نے ان کی ہمت کو لٹکا رکھا
 وہ سوچتے ہی ارادین کے جن کی طرح وہیں حاضر تھے۔ اپنے پورے اونچے بھاری
 بھر کم قدر اور فدا ہو جانے والے انداز کے ساتھ۔ اور کوئی وقت ہوتا تو وہ
 ادرہ زنہ نے میں قدم بھی نہ دھرتے، مگر اس وقت ان کے نصیب سے
 پوری حویلی خالی تھی۔ سب لڑکیاں بالیاں، نوکر، چاکر، حویلی سے گئے
 ہوئے تھے۔ بھلا اباتی کہیں جائیں تو پوری فوج ساتھ کیسے نہ جائے۔ وہ تو
 ایک اتفاق تھا نہ مارے گری کے مہر آراء کا جی الٹ پلٹ ہو رہا تھا تو اس

اماں نی سے معذرت کر لی تھی کہ وہ بالکل نہیں جاسکتی، اسے گھر پر رہنے کی اجازت دے دی جائے کہ صندل کے پانی سے غسل کر کے ذرا تراوٹ چال کرے ویدھے اور وسوسوں والی امنی نے پہلے تو ذرا شک سے مہر آرا کو دیکھا، لیکن بھوسے کھالے چہرے پر کسی بھی قسم کی گھبراہٹ نہ پا کر کہہ دیا۔ "کرمین سے بول دید۔" صندل والا پانی تیار کرنے کو رکھ دے۔ پر اتنی بات، یاد رکھو کی ہذا کو ایک دم کھلے آنکھیں میں مت نکل کو آنا۔ چپ کے چپ، نہیں تو بخار و خارا آجائیں گا۔ ہور بالال چھ سے پونچھنا۔ سب احکام قبول کر کے مہر آراء جانے لگی تو ادھر سے اتنا اور سنا دیا۔ "ہور سنو، بی بی شام پڑے عطر و طرمت لگانا، بن نارج لٹ پلٹ ہونے کو۔"

اور جو حجان جسم کا عطر خود یہاں سے وہاں تک نیتوں کو ڈالناں ڈول کرتا پھر رہا تھا؟ اس کے بارے میں اماں نی کوئی ہدایت کیا دے پاتیں۔ اور ساری آگ تو اسی کی لگائی ہوئی تھی جیسے ہی مہر آراء اپنے آراستہ سرخ محل میں پہنچی (اماں نی نے سب لڑکیوں کو انہیں کی پسند کے مطابق ایک ایک کمرہ ایسا عنایت کر دیا تھا۔ جس میں دیواروں سے لے کر قالین، پردے، دیوان، چادریں غلاف اور فانوس تک ہند کے ہی رنگ کے لگوائے جاتے تھے۔ مہر آراء سرخ رنگ کی دیوانی تھی۔ اس کے جھٹے میں سرخ محل آیا تھا اس کے سر پر سے آگ سی لگی ہوئی تھی۔ تنہائی کی بھرپور شہ پاکر بڑے سرکار بھی ادھر ہی کھینچے چلے آئے اور گلاب رنگ کلی دیکھ کر آئیٹھنے میں زور سے ہنس پڑے مہر آراء نے لرز کر، گھبرا کر سہم کر آئیٹھنے میں دیکھا اور پھر ایک دم پیچھے پلٹ پڑی اور یوں بڑے سرکار کا سامنا ہو گیا جب جب کچھ نہ سوچا تو مارے گھبراہٹ کے جانے کیسے اسے آداب محفل یاد آئے۔

— سر کو جھکا کر نازک سے حسین پیشانی کو چھو کر۔

بولی "آداب عرض ہے۔"

بڑے سرکار اس وقت بڑی موج میں تھے آگے بڑھ کر اسے پوری کی پوری اپنے بازوؤں میں بھر کر بولے "ہم تو مرد ہیں مرد — اور جانتی ہو۔
مرد سلام کا جواب کس طرح دیا کرتے ہیں۔؟"

مہر آرا اس اچانک وار کے لئے قطعاً تیار نہ تھی۔ بغیر کسی گہما گہمی کے، بغیر تاشے باجوں کے، بنا کسی دھوم دھڑکتے کے، بنا کسی تیاری کے، یہ چاک سہاگ رات کیسے آگئی۔ لیکن نس نس کرتی جوانی نے اسے کچھ سوچنے اور بچاؤ کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ بڑے سرکار نے ایک مردہی طرح اس کے آداب کا جواب دیا — اور ایسا جواب؟ مارے شرم، گھبراہٹ اور سکراہٹوں کے بوجھ کے اس کی آنکھ اوپر اٹھتی تھی، نہ کھلتی تھی۔

طلسم اس وقت ٹوٹا جب کریم دودھ کا گرم گرم پیالہ پاشا کے لئے لے کر آئی۔ بڑے سرکار کنڈی چڑھاٹے بیٹھتے کھڑکھڑ پر دروازہ کھولنے گئے یہ بھی نہ سوچا کہ کریم کیا سوچے گی، بھڑسے دروازہ کھلا اور ایک دیو زاد کی طرح انھیں چھایا دیکھ کر کریم کے ہاتھ پورا گرم گرم دودھ ان کے پیروں پر گر پڑا۔ ان کے مونہہ سے "سی" کی آواز نکلی اور کھلے بالوں کی گھٹا لہراتی مہر آرا اپنے پلنگ پر سے کود چوکھٹ میں کھڑی ہوئی کریم کے سر پر جا سوار ہوئی اور پورے بیویوں والے انداز میں ڈانٹ کر بولی "ہوری اندھی ہے کیا؟ وہ تو اچھا ہوا کہ ان کے پاؤں میں جڑا بن تھے۔ ہو کبھی چھالے والے پڑ جاتے تو؟ صرف دس منٹ کی قربت نے کس قدر اسے زیادہ سنا یاد دیا تھا۔ لیکن کریم اس لاندھے سے کہاں سوچ سکتی تھی۔ اس نے کبھی آنکھوں سے پس یہی دیکھا کہ بڑے سرکار اور

پاشا ایک کمرے میں بند تھے۔ اس آنکھوں کی اندھی نے چہرے پر چمکتے چاند دیکھے نہ سانسوں میں مہکتا عطر دیکھا۔ گالوں پہ کھلتا گلال دیکھا، نہ آنکھوں میں محبتوں کے چمکتے ستارے پرکھے، وہ یہ سب دیکھتی بھی کیوں اور کیسے؟ اس کا تو کام ہی یہ تھا کہ رخصتی تک بس مہر آرا و پرکڑی نگاہ اور پابندی رکھے اور لاکھ نکاح ہو بھی چکا تھا۔ تب بھی اس کا فرض تھا کہ بڑے سرکار کو اس کے کمرے میں آنے سے روکے۔ خدا رسول کی نگاہ میں تو وہ ایک ہو ہی چکے تھے اور یہی گناہ انھوں نے کیا نہیں تھا۔ لیکن دنیا والوں نے بھی کچھ اپنے اصول بنائے ہیں ان کو بھی تو نبھانا ہی پڑتا ہے۔

ہوا یہ کہ مہر آرا چونکہ بے حد حسین تھی اور بصالت جنگ یعنی بڑے سرکار (جو دراصل چھوٹے سرکار تھے مگر بھائیوں میں بڑے ہونے کی وجہ سے بڑے کہلاتے تھے)، اسے ایک شادی کی محفل میں دیکھ کر داری صدر قے ہو چکے تھے، اس لئے چاہتے تھے کہ کسی بھی حالت میں اسے دلہن بنا کر ہی دم لیں۔ اور مہر آرا بھی معمولی لڑکی نہیں تھی ایک بڑی جاگیر کے مالک نواب باب کی بیٹی تھی اس کی اہمیت یوں بھی زیادہ تھی کہ ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی، اور پانچ بھائیوں کی بہن تھی۔ قاعدے کے مطابق جب بصالت جنگ کا پیام بڑی حویلی میں بھجوا یا گیا تو لڑکی والوں کو ان میں ایسی کوئی بات ہی نظر نہ آئی۔ کہ پیام رو کیا جاتا۔ ہر لحاظ سے ہر عیار پر پورے اترتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ بھی ایک حماقت کی رسم چلی آرہی ہے کہ اپنی بڑائی جتانے کو خواہ مخواہ "ہاں" کہنے میں دیر کی جاوے، اس لئے یہی حماقت اس وقت بھی لڑکی والوں نے کی۔ اور ویسے یہ حیدر آباد کا پرانا دستور ہے کہ بعض مرتبہ ضرور نا اور

سیف مرتبہ بالکل اکثر طبعاً لئے کو۔ بس لڑکی کا عقد پڑھا دیتے ہیں۔ اور رخصتی سال
دو سال کے بعد کے لئے اٹھائے کھتے ہیں۔ ضرورتاً میں یہ ہوتا ہے کہ کئی بار لڑکی تعلیم
حاصل کر رہی ہوتی ہے۔ یا اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ شادی کے یا گھر بار سنبھالنے کے
قابل ہی نہیں ہوتی۔ لیکن چونکہ یہ دگرا لگا رہتا ہے کہ لڑکا اچھا ہے۔ ہاتھ سے نکل
نہ جائے۔ اس لئے صرف عقد پڑھوا لیا جاتا ہے۔ اور بعد میں ایک اور زور شو کے
ہنگامے کے ساتھ مقررہ مدت کے بعد دلہن کو رخصت کیا جاتا ہے۔ کہاں تو
بصالت جنگ مہر آراء کے وصال کے لئے مرے جا رہے تھے اور کہاں نہیں
بھی اسی دوسری شادی کے چکر میں بچس جانا پڑا۔ یا تو یہ طے کئے بیٹھے تھے
کہ شادی ہوگی اور جنت کے مزے لوٹیں گے، یا یہ ہوا کہ صرف عقد یہ بات
ٹٹائی اور فرقت کی آگ کو دوزخ کی پیش سے بڑھ کر بھگتا۔

مہر آراء یہ ان کا دل آ جانا کوئی ایسی انہونی بات تھی بھی نہیں۔ حسن کی
مورت تھی، شباب کا عالم تھا۔ پھر انہوں نے تو اسے اپنی سہیلیوں کے جبرمٹ
میں ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے بھی دیکھا اور سنا تھا۔ جو حیدر آبادی اور
یوپی کی بلی زبان بولتی تھی۔ جو نکو بولتی تھی، "اماں نی بولتی تھی، مگر لہجہ
یوپی والوں کا سا تھا۔ جس نے گھر پر رہ کر دہلی والی استانی سے تعلیم حاصل
کی تھی، جس نے دوسری دور سے جلوہ دکھا کر انہیں اپنا دلوانہ بنالیا تھا۔ اور
در اصل ساری گڑ بڑ یہی تھی کہ چونکہ انہوں نے اسے ایک شادی کے ہنگامے میں
دیکھا تھا، اس لئے شادی کی مناسبت سے اس نے کپڑے بھی ایسے چھل
چھل پہن رکھے تھے، زریور بھی ایسا جھکا جھول اور جگر مگر کرتا سجا رکھا تھا کہ نہیں
آتا ہوا دل آ جاتا۔

پہلے تو دو لہا والوں نے بہت ہجر محری۔ بہت باتیں بنائیں کہ شادی رخصتی سب ساتھ ساتھ ہو جائے۔ مگر دہن والوں کی ایک نہ ہزار نہ — وہی اڑ کہ لڑکی ابھی چھوٹی ہے، بڑھ رہی ہے۔ اور حقیقت یہ تھی کہ ایسی کوئی بات تھی ہی نہیں۔ یہ ضرور تھا کہ مہر آراء ابھی ابھی کلی سے پھول کی مانند کھلی تھی۔ لیکن کیا کم سنی میں شادیاں نہیں کی جاتیں۔ مگر وہاں تو سارا سلسلہ یہ تھا کہ لڑکی کا مان بڑھایا جائے۔ بڑے نواب صاحب ہمیشہ کہتے تھے — اور ہر پیام آیا اور شادی کر دی تو لڑکی کی کوئی خدہ نہیں رہتی۔ جب تک جوتے کا تلا اور چوکھٹ ایرا پھیری میں گھسنے جا میں وہ شادی ہی کیا ہوتی — اور اب انکی خواہش کے مطابق مشاطہ کی کا کا مدار جوتا گھسنے کے قریب آچکا تھا۔ اور جوتی کی چوکھٹ ان کے جوتے کی رگڑ کھاتے کھاتے دھول اڑانے لگی تھی۔ اور شادی کی تاریخیں قریب سے قریب آرہی تھیں کہ جو ان کی بے تابی کے ہاتھوں یہ گل کھل گیا۔

کریمین باہر دوڑنے کو لپکی کہ کسی نہ کسی کو یہ راز سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کرے کہ بڑے سرکار نے کس کراس کی کلائی پکڑ لی۔ وہ پہلے ہی بادی ہو رہی تھی اب تو با مکمل ہی گڑ بڑا گئی۔

”پہلے وعدہ کر دیا کہ کسی سے نہ کہو گی،“ ایک تو بڑے سرکار غیب داب ہی ایسا تھا۔ اس پر دہلی والی ماں کے بیٹے تھے کہ بات کرتے میں جن کے منہ سے پھول جھڑتے تھے — کریمین کے منہ سے کچھ نکلتا تب نا جب تک وہ اپنا ٹوہ اس کے حوالے کر چکے تھے۔ جس میں کی سو جانی روپے جھن جھنارہے تھے۔

پیسہ اگر سب سے بڑی طاقت نہیں تو بہت بڑی طاقت ضرور ہے۔ کرین
نے اپنا مونہہ سی لیا۔ لیکن ہیرا آراء جو نرم گرم دوسوں کے سحر سے اب آزاد ہو چکی تھی
پریشان ہو کر بولی: ”ہو کچھ ہو گیا تو جی؟“

اس کچھ کا مطلب خود بڑے سرکار بھی اچھی طرح سمجھتے تھے لیکن اس سہاگ
رات کا سحر جو وقت سے کچھ پہلے ہی آچکی تھی، ابھی تک ٹوٹا نہ تھا۔ وہ اسی الھڑ
پن سے بولے: ”تو کیا ہو گا؟ ہم ایک بیٹے کے باپ بن جائیں گے۔“

باد جو پریشانی کے مہر آرا کر ہنسی آگئی۔ لیکن یہ ہنسی جلد ہی ساتھ چھوڑ
گئی۔ اسے اپنی ایک ساتھ کھیلی سہیلی کی واردات اچانک یاد آگئی۔ جس کا اسی
کی طرح نکاح ہوا تھا۔ رخصتی ہونی باقی تھی کہ کسی نہ کسی طرح تاک جھانک
میں وہ دو لہامیاں کے ہتھے چڑھ گئی۔ اور خدا کا کرنا اس کا پیر بھاری ہو گیا۔ اب
کون گواہی دیتا کہ یہ گناہ نہیں تھا۔ اور اسی کا بچہ تھا۔ جس کو خدا رسول کے
نام کے ساتھ اس کی زندگی کا حصہ دار بنایا گیا تھا۔ مگر ایسی بدنامی ہوئی کہ پھر اس
کا چاہنے والا بھی رخصت کر کر نہ لے گیا۔ کہیں وہی حشر اس کا بھی نہ ہو! اس نے
گہرے شبہ کے ساتھ سراٹھا کر بڑے سرکار کو دیکھا۔ لیکن اسی لمحے اسے وہ
جملہ یاد آگیا: ”ہم تو مرد ہیں مرد۔ اور جانتی ہو مرد آدرہ کا جواب کس طرح
دیا کرتے ہیں۔؟“

ایک دم اس کا دل سارے دوسوں سے پاک ہو گیا۔ جس کا مرد اس نے
تیجے کا ہوا سے کیا پڑ؟

اس کا دل نشے میں ڈوب گیا۔

دونوں باتیں ایک ہی ساتھ ہوئیں۔ اس دن مہر آرا صبح کو اٹھی، تو

حسب معمول موہنہ دھونے حمام میں گئی، وہاں اسے اپنی آپتے ہو گئی۔ تتلی کے شدید جھٹکوں نے اسے بے حال کر کے رکھ دیا اور اسی دن لڑکے والوں کے یہاں سے سندھیہ آیا کہ کبھی اب تک معاملہ لیت و حل میں رہے کھئے گا۔ عقد کو پوسے تین برس گزر چکے ہیں۔ خیر سے صاحبزادی بھی اپنی تعلیم پوری کر چکی ہیں اور اب اس سن میں آپکی ہیں کہ ایک بیوی بہو، اور ماں کے فرائض بخوبی انجام دے سکیں۔ اس لئے اب بسم اللہ کیجئے۔

اماں نے بھی سوچ بچار کر بسم اللہ تو کرادی، مگر ساتھ ہی یہ بھی نیوتا بھجوا دیا کہ ہماری اکلوتی ایک بچی ہے۔ سارے ارماناں ہم نا اس پر نکالنا ہیں۔ اس واسطے ابھی جہیز کپڑا تیار کرنے کو ہم نانیئیں کچھ دو تین ہسینے تو دیو۔“

جب تین سال انتظار کیا تو تین ماہ کی کیا بات تھی؟ دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں عروج پر آئیں۔ عقد کے وقت کے گھنے پاتے، کپڑا سب بیکار قرار دیا گیا نئے سرے سے مہر آرا کو دوہن بنا تھا۔ اسی لئے نئے سرے سے سب جوڑہ جھاڑ شروع ہوا۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ حیدر آباد کی تاریخ میں ایسی گہما گہمی، ایسا ہنگامہ، ایسا رکھ رکھاؤ ایسا جھجکاؤ کسی جنگ کے یہاں شادی میں دیکھنے میں نہ آیا۔ دہریوں کی حویلی جو اتنی بڑی تھی کہ کوئی دیکھنے کو اٹھتا تو حویلی کے اندر ہی اندر صبح سے دوپہر ڈھل جاتی۔ جگر جگر کر رہی تھی۔ ہر کرہ جہیز سے اٹا پڑا تھا۔ اس کمرے میں صرف کپڑے، اس میں زبرد، اس میں برتن اس میں نوادرات، اس میں اکت اس میں دھمک۔ پھر یہ تمام ایک کمرے میں صرف دوپٹے ہی دوپٹے۔ کھڑے، آڑے، گولٹے، کناری لگے، کرن بانکڑی ٹنگے۔ دوسرے میں کرتے

جھپا جھپ، کادانی، کارگے، چکن، آب رداں، جاپانی ریشم، مسالے، چمکی سلمہ، ستارے کے کام والے، اسی طرح ہر ہر کمرے میں الگ الگ سجاوٹ تھی عقد تو ہوا ہوا یا تھا ہی۔ صرف یہ تھا کہ دلہن کو سجا سوار کر مع جہیز کے کسرال وداع کرنا تھا۔

ان تین مہینوں میں مہر آرا کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔ ادل ادل ماں بٹنے کا تمام غم اس پرداری بچہ اور تھا۔ چال میں وہ دل فربا اور مستی آگئی تھی جو خدا نے صرف ماں بننے والی عورت ہی کے لئے رکھ دی ہے۔

دلہن بنی ہوئی مہر آرا کو دیکھنے کی خاطر سارے حیدر آباد کی بیگمات اُٹدی پڑ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ سارے سنگار ختم ہو گئے۔ اور خدا خدا کر کے وہ گھڑی آئی جب مہر آرا کو بیچ کے ہال میں جانا تھا۔ مغلانی بی نے پیچھے سے جھٹکا جھول پاشیچے سمجھالے۔ کم غلاب کا غرارہ تھا۔ اور گوڑے سے اتنا لدا پھندا تھا کہ کہ دلہن کو سنبھالنا بار تھا۔ سہیلیوں نے پتہ کھالے۔ آہستہ آہستہ دلہن چلی۔

— ایک قدم، دو قدم —

اسی دم دولہا دایوں میں سے کوئی بولی: ”ایو یہ دلہن کیسی چل رہی کی، جیسے مہینے دو مہینے ہو کو گئے۔“

ایک کے مونہہ سے نکلی، دوسرے کے منہ چڑھی۔ دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی۔ اور پھر تو کھلبلی سی پچ گئی۔ آخر کوئی ڈھٹائی سے پکار کر بول ہی اٹھی۔ ”ایو ارے دلہن تو محل سے ہے جی پاشا۔“

یہ وہ وقت تھا کہ مردانے سے دولہا میاں سہرا باندھے، بچے، سونے شہزادے سے بنے۔ زنانے میں لاکر زربیں دیوان پر بٹھائے ہی گئے تھے اپنی

جگہ رہ بھی ٹھٹھک سے گئے۔ دہن کی اماں نی کا کلیجہ پانی ہوا جارہا تھا۔ حیدر آباد
میں دو ایک ہی گھر نے اتنی اونچائی پر ہوں گے۔ اور ایسی بھدر۔

”ایو مہر آرا۔۔۔ یہ تو نے کیا کر دی گے۔ یہ بدنامی کا ٹیکہ کاں سے لائی
گے۔ اب تیرے کو کون بیاہ کر لے جائے والا۔ یہ عمر بھر کو کیسا نکٹا کری گے
یہ بین ان کے دل سے پھوٹ رہے تھے۔ مونہہ پہ تلے پڑے ہوئے تھے۔ سکتے
کا سا عالم طاری تھا۔

دو دہن دایوں میں سے کوئی کفن پھاڑ کر چیخنی ”کون چھناں بولی کی پاشا پیٹ
لے ہیں۔۔۔ بولنے والے ہوں گی خود۔ یہاں کے یہاں ایسا سلوک کر رہیں تو سیرال
میں لے جا لکھوب خد کریں گے یہ لوگاں، ایو سنو تو ذرا بولتیں صاحب زادی امید
سے ہیں۔۔۔“ اس کی چیخ و پکار پر کسی نے یہ کیا کہ دائی بوا کو سامنے لا کھڑا کیا۔ ایسی
شادی میہمانی کے موقعوں پر یہ تو ہوتا ہی ہے کہ ایک سرے سے پورا گھر ہی سمجھنا
میں اُٹ پڑتا ہے۔ نوکر چاکر سے لے کر ماٹائیں، منگانیوں، دائیاں تک۔

دائی بوا تو ایسی تھیں کہ سانس سو نہ گھ کر ہی تباہ دیتیں کہ کتنے دنوں کا معاملہ
ہے۔ یہاں تو پورے تین ماہ چڑھ چکے تھے۔ پہرے پر چاند چمک ٹھاکتا۔
اکھڑوں نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے دیکھا اند بڑی بے پروائی سے کہہ دیا

”ایو مبارک بناب ساب چھ ماہ بعد سوئے کے کڑے یوں گی، اور ہاتھ

بھر بھر چاندی کے چوڑیاں۔“

یہ ایسی بات تھی جس نے اماں نی کے حواس وٹ لٹے۔ پورے شہر کے

لوگوں کے سامنے کیسی تھڑی تھڑی ہو رہی تھی۔ مولائیں چلتا تو اس پیٹ کی
لوٹی اولاد کو کچا بھاڑ نہ کھاتیں جس نے آج ناک یوں کاٹ کر رکھ دی تھی!

شیرنی کی سی گرج کے ساتھ وہ لپکیں اور ایک جھٹکے سے مہر آرا کا گھونگھٹ
 نوچ کر دور پھینک کر بولیں : کس کا اٹھا کر لائی یہ بیج ! بول نا نکٹی !“
 مہر آرا نے زڑیں دیوان پر بیٹھے بصلالت جنگ کی طرف بڑی
 آس بھری نظروں سے دیکھا، اس کے چتے ذہن پر یادوں کی حسین پھوار
 برسی — ”ہم تو مرد ہیں مرد —“ یہ مرد اگر اپنی زبان کھولے اور سب
 کے سامنے کہہ دے ”یہ پھل میرا ہے۔“ تو وہ کس قدر سُرخ رو ہو جاوے
 کتنی اونچی ہو جائے۔

لیکن ان معصوم نگاہوں کی تاب نہ لا کر، بصلالت جنگ نے سر
 جھکا لیا۔ اتنے سارے لوگوں کے سامنے ان کی بہت جواب دے
 گئی۔ وہ کیسے بدنای کا اتنا بڑا بوجھ اٹھا لیتے۔؟
 عین اسی وقت بھیڑ کو چیرتی ہوئی کریمین آئی اور پھولی سانسوں کے
 درمیان بولی ”میرے کو سب معلوم ہے۔ میری پاشا بھوت بھولے ہیں۔ یہ
 سارے کرتوت انوں کے ہیں جو سہرا باندھ لے کو پھول سجائے کو بیٹھیں۔“
 لیکن مہر آرا نے ایک دم کریمین کو اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اور بے حسد
 حقارت سے بصلالت جنگ کی طرف اشارہ کر کے بولی ”میرے پیٹ میں اور
 اس کا پھل؟ اس نامرد کا؟ یہ تو بیچڑہ ہے، بیچڑہ۔“
 بھری محفل میں پس پڑ گئی اور بصلالت جنگ کا جھکا ہوا سر زندگی
 بھر کے لئے جھک کر رہ گیا۔

لڑکی بازار

حیدر آباد دکن کی ایک جگہ گاتی صبح تھی۔ آفتاب ابھی کچھ نہیں نکلا تھا۔ کچھ چھپا تھا۔ اسی دم بانغ شاہی سے ایک ڈھنڈو رچی، سفید کنڑک پا جامہ، سفید ٹل کا کرتا، پہنے، ترچھی ٹوپی لگائے، سلیم شاہی جو تیا پہنے بڑی فصیح و بلیغ زبان میں ڈھنڈورا پیٹتا ہوا نکلا۔

"لڑکیوں واں ماؤں سے استدعا ہے کہ کل بروز جمعہ بعد نماز عصر، حسبِ سابق، اپنی اپنی بیٹیوں کو بہ حیدر آباد خاص خصوصی لباس اور پُر تکلف آرائش و زیبائش کے ساتھ بانغ شاہی میں منعقد ہونے والے مینا بازار میں لے کر موجود ہو جائیں۔ بانغ شاہی میں داخلے کی کوئی رقم نہیں ہے۔ بگھیاں، شکراٹیں، ہاتھ دکشا، جو جو بھی بیبیوں کو لائیں گے کو یہ بانغ شاہی سے وصول پائیں گے۔ اس طرح ماؤں کو یہ اصطلاح دی جاتی ہے کہ کل کی شاہی سیرا بھیں بالکل مفت پڑے گی۔ تن تن - ٹنائن - ٹنائن۔

حیدر عبدہر سے ڈھنڈو رچی ڈھنڈورا پیٹتا گزرا ماؤں کے کلبے دھلتے گئے۔

"کل کی شاہی سیر اٹھیں بالکل مفت پڑے گی۔ اس بالکل مفت نے ماڈن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے ابھرا دیئے۔ چلنے مان لیا یاغ شاہی میں داخلے کی کوئی رقم نہ ہوگی جس بجھی یا شکرام یا ہتھ رکشا یاں آپ سوار ہو کر جائیں گی اس کا کرایہ تک حبیب یا جنگل ادھر سے لے کر سیر سپانا کرنے میں جو بھی چیز آپ کو پسند آجائے گی۔ آپ اسے مفت ہی لے بھی سکیں گے۔ لیکن اس مفت کے بدلے اٹھیں جو کچھ دینا ہوگا۔ وہ کوئی بھی ماں مہنی خوشی کبھی دے بھی سکی ہے؛ لیکن نئے بنا چارہ بھی کیا تھا، یہاں سے یہاں سے ہر گھر سے گھٹی گھٹی چیزیں اور تم ہوں نے اس حکمران کی عیب کو کجلا کر رکھ دیا۔

سرشام فانوس کی روشنی سے جب نور محل جھم جھما اٹھا تو حبیب یا جنگ اپنی بڑی سی توند سنبھالے اپنی مخصوص چال سے چلتے نرم نرم دیوان پر جا کر بیٹھ گئے جس پر کاغذ اسند بھی ہوئی تھی۔ گاڈ تیکہ ان کی پیٹھ کے بوجھ سے پیچ سے ذرا دب کر ابھرا تھا۔ سونے کا سلمہ چاندی کے تارے پھر رہ کر جھللاٹنگے۔ خادم نے بڑے ادب سے ان کے آگے سونے کی کشتی میں تارنجی رنگ کی انگریزی شراب کی بوتل اور کٹ گلاس کے جھلکتے جام لا کر رکھے۔ (کہ حضور کا کہنا تھا تھا کہ شراب تو بس شیشے ہی میں مزہ دیتی ہے۔ یہ بھی کوئی بادام کا حریر ہے کہ جسے سونے کے پیالے میں پیا جائے)۔ قریبی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہی ایک طراری خادمہ تلے ہوئے سرخ سرخ کہاؤں کا حشت اٹھائے لچکتی بل کھاتی آئی اور اسی حرام زادگی سے منگتی وہیں چلی گئی۔ افطار کی نیت پڑھ کر نواب صاحب نے شراب سے روزہ کھولا۔ اور تالی بجا کر ایک خادم کو طلب کیا۔ خادم تقریباً دہرا ہو کر آیا۔ اس نے نواب صاحب کو سراٹھا کر دیکھا، ہی نہیں کہ ان کے چہرے کا غیض و غضب دیکھتا اس لئے جب کرک

آواز میں نواب صاحب نے پوچھا ”ہو جناب وہ مرزا صاحب کہاں مر گئیں۔“
 تو وہ یونہی کا پتہ ہوا ہولا۔ ”دیکھتا ہوں سرکار۔“ اپنچ گیا کی اپنچ آیا۔“
 یہ نواب صاحب کے غصے کی انتہا ہوتی تھی کہ وہ کسی نوکر کو جناب کہہ کر
 مخاطب کر لیں۔

مرزا صاحب بھی تقریباً اسی انداز سے محل میں وارد ہوئے۔ لیکن نواب
 صاحب کے مخاطب کرنے پر انھوں نے البتہ: نفوں نے ان کے چہرے کو دیکھنے کی
 سعادت ضرور حاصل کی۔

”خادم حاضر ہے۔“

”حاضر ہے تو کیا میں چاٹوں خادم کو؟ حضرت میں آپ کو صبح ہی بولا
 تھا کہ دن بھر کے رزے کے بعد شام تک میرا مزاج بہت گرم ہو جاتا ہے پر آپ
 کو تو کچھ یاد پچ نہیں رہتا۔“

مرزا صاحب نے جوڑے ہوئے ہاتھ سرسیمہ ہو کر ایک بار کھول کر پھر باندھ
 لئے۔ وہ اب تک بھی سمجھ نہ پائے تھے کہ ان سے کیا خطا سرزد ہو گئی ہے۔ نواب
 صاحب خود ہی چسٹ پڑے۔ ”میں آپ سے بولا تھا کہ پچھلے سال میں جتنی بھی شایاں
 کیا تھا ان سبھی کو آج رات میں طلاق دینا ہے۔ سو آپ وہ ناماں کی فہرست تیار
 کرے کیا نہیں؟“

مرزا صاحب کے دم میں دم آ گیا۔ ”جی بندہ پروردہ تو میں دوپہر میں اپنچ
 ہو رہی کر لیا۔“

”تو وہ آپ میرے کو لا کر بیجئے۔ میں تراویح کی نماز کے بعد سب کو بلا کر طلاق
 دے دوں گا۔“

”بہت بہتر بندہ پروردہ....“

”پرندہ پرندہ.....“ نواب صاحب گرجے۔ پھر انھوں نے شراب کا

ایک گھونٹ بھرا اور کچھ نرم پڑ کر بولے ”پر کیا؟“

”وہ حضور چند بیگمات اُتید سے بھی ہیں۔“

”تو اسی لئے تو طلاخ دینا ہے کہ ہمیں شبہ ہے یہ بچتے ہمارے نہیں۔“

بدچلن عورتوں سے کوئی کیسے نباہ کر سکتا ہے۔؟ مہران شریف میں آیا ہے کہ جب

مصالحات اور معاملات کی کوئی شکل باقی نہ رہ جائے تو طلاخ جائز ہے۔“

مرزا صاحب نے دُبدھے کے ساتھ نواب صاحب پر نگاہ ڈالی۔ مرزا صاحب

تھے تو نوکر، مگر نواب صاحب کی ناک کے بال بھی تھے۔ چونکہ مہر بھی تھے، اس لئے

غصہ تھپا کرنے کے باوجود نواب صاحب ان کی عزت کر رہے تھے۔ اور ان کی اکثر

باتیں مان بھی جایا کرتے تھے۔ اور نہ مانتے تو کرتے بھی کیا؟ ان کی پراسیڈنٹ زندگی

تقریباً ان ہی کے ہاتھ میں تھی۔

تراویح کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد نواب صاحب نے باجماعت

اپنی کمسن بیویوں کو طلب کیا۔ ننھی منی لڑکیاں بھنوں نے کوئی نیچ اوپ نیچ نہ دیکھی

تھی، جن میں سے کئی نے پاکی کا پہلا غسل بھی اسی غسل میں آکر لیا تھا۔ جن کے چہروں

پر بے کسی کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ لاشن سے آکر کھڑی ہو گئیں۔ نواب صاحب نے

ایسی اجنبی نظریں ان چہروں پر ڈالیں جیسے کبھی ان سے کوئی شناسائی نہ رہی ہو۔

مرزا صاحب نہرست ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ نواب صاحب کے اشارے پر انھوں

نے نام پڑھنے شروع کئے۔

عائشہ بیگم۔ عمر پندرہ سال

(”میری نوزخ جوانی کا رس پہلے پہل آپ نے چوسا، میری ادلین بہار کے پھول آپ نے چنے اور آج آپ کو طلاق دیتے ہوئے میرا نام تک یاد نہیں آتا!) لیکن بھولے بھالے چہرے کی ایسی کوئی ان کہی تحریرِ نواب کی آنکھ سے نہ پڑھی گئی۔ انھوں نے بے حس آواز سے فرمایا۔ ”عائشہ بیگم ہم آپ کو تین بار طلاق دے کر اپنے عقد (عقد) سے باہر کرتے ہیں۔“ اور انھوں نے ایک کاغذ ان کے ہاتھوں میں پکڑا دیا اور گویا ہوتے ہوئے ”مگر آپ کو تا زندگی ہماری جائیداد سے دس روپے مال نہ آپ کے نان نفقے یعنی آپ کی گزر و خراجات اور بیاں بچہ کوئی چہا بچا تناس کی پرورش کو ملتے رہیں گے۔ حالانکہ ہم کو شک ہے کہ آپ کے بطن میں ہمارا بچہ ہے۔ اپنے اپنے طرف اور اوقات (اوقات) کی بات ہے۔ ہم سے ایک سال میں کوئی بھول چوک ہوئی ہوتی تو ہم خود معافی مانگ لیتے، مگر ہم کو معلوم ہے کہ اس محل میں آپ کو کوئی دکھ نہیں پہنچا۔ خدا حافظ۔“

سلیمہ بیگم - عمر ۱۲ سال

رشیہ زمانی - عمر ۱۵ سال

قمر سلطانہ - عمر ۱۶ سال

پیاری بی - عمر ۱۳ سال

مبارک بیگم - زہرہ بی بی - فاطمہ بیگم - شریا - نشاط آراء۔

..... مرزا صاحب نام پکارتے گئے اور نواب صاحب سب کے ہاتھوں میں

ان ہی بندھے تیلے جملوں کے ساتھ طلاق نامے پکڑا لے گئے۔ کسی کی عمر ۶ سال

سے زیادہ نہ تھی۔ کوئی چہرہ پھول سے کم نہ تھا۔ کوئی نگاہ ایسی نہ تھی جس میں فریاد

نہ ہو۔ کوئی لب ایسا نہ تھا کہ داد رسی کے لئے دامن ہونا چاہتا ہو۔ لیکن کسی میں اتنی

ہمت نہ تھی کہ آنکھ اٹھا کر بات کرنے کا بھی حوصلہ ہوتا کہ یہی اس محل کا قانون تھا
 فقور ابہت چھوڑ کر تقریباً پاؤ حیدر آباد حبیب یار جنگ کی جاگیر میں
 شامل تھا۔ ان کی جاگیر میں کوئی پیدل چلنے کو کھڑا ہوتا تو ادھر کا سورج ادھر
 ہو جاتا مگر وہ سلطنت ختم نہ ہوتی۔ ان کے بڑوں نے شاہوں کا دل جتیا تھا، اس
 کے صلے میں جاگیریں اتنی بخشی گئیں، اتنی بخشی گئیں کہ پھر ان کے نام تک یاد نہ رہے
 قدم قدم پر ان کے بڑوں کی تعمیر کردہ کوٹھیاں حویلیاں اور ڈیوڑھیاں بھٹیں۔ اور
 ان سے متصل نوکر خانے۔ پھر یہ تھا کہ جہاں جہاں ان کی حکومت بڑھتی گئی
 وہ چھوٹے چھوٹے جہان آباد کرتے گئے۔ حبیب یار جنگ کے دادا۔

حیدر آباد کے تاجدار کے ناک کے بال تھے۔ انھوں نے، کہتے ہیں اپنا
 محل تاجدار دکن کی مرضی سے ہی (چوری سے نہیں) اس طرح بھرا تھا کہ عام طور سے
 ڈیوڑھیوں میں، آہنی چھانک سے لے کر مردانی بیٹھک تک ڈرائیو سے
 کے آزاد بازو جو سرخ کنکری والی بحری بچھی ہوتی ہے۔ ہر جگہ ان کے محل میں
 دور دراز موٹی مونگے، ہیرے جواہر بچھے ہوئے تھے۔ جن کو چرانے کی کسی میں کیا ہمت
 ہوتی کہ بری نظر ڈالنے والے کا شبہ ہوتے ہی کورڈوں سے مار مار کر بھرتا نکال دیا
 جاتا۔

جتنی بھی ڈیوڑھیاں، کوٹھیاں اور حویلیاں بھٹیں وہ سب حبیب یار
 جنگ نے کرائے پر اٹھادی بھٹیں، کیونکہ دھندلے خالی پڑے ہوئے تھے۔ اور کوئی
 مسرت ان کا نظر نہ آتا تھا۔ پھر یہ تھا کہ جتنے بھی کرایہ دار تھے سب انھیں جاگیر
 کے ملازم، انہی کی رعیت۔ جنھیں سراسر اٹھانے کی مہلت صرف خدا کے سامنے
 تھی کہ آسمان کو دیکھیں اور اپنی بد نصیبیوں کا شکوہ کریں۔ نواب صاحب کے ربوہ

تو ان کے سر صرف جھکنا ہی جانتے تھے۔

مہتاب نے ذری گوئے سے لپا پتا جوڑا اٹھا کر دور پھینک دیا اور چلا

کر بولی: ”میں کہیں نہیں جاؤں گی امی۔“

”نیٹس جائیں گی تو بن موت مریں گی، کیا تیرے کو معلوم نہیں اس احاطے

میں بیٹے والیوں کو اس سالانہ جلسے میں شامل ہوتا ہے پڑتا ہے؟“

”میرے کو سب معلوم ہے، یہ بھی معلوم ہے کہ اس بازار میں جانے کا مطلب

ہے اپنی زندگی کی خوشیاں اپنے آپ پر حرام کر لیں۔“

مہتاب کو ملہ عالی جاہ کی دہم جماعت کی ہونہار طابہ تھی اور اپنی عمر سے

کہیں زیادہ سوچ بوجھ رکھتی تھی۔

سکینہ بیگم نے رحم بھری نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا

”اتی سمجھ رہا ہو کر بھی تو کیوں ایسے نا کجھی کے باتاں کر رہی تابی میری سمجھ میں

نہیں آتا۔“

”تابی، ٹھیاں تان کر چلائی،“ امی آپ کو معلوم نہیں کی میری شادی ہو چکی؟

سکینہ بیگم نے اس کے مونہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”اری نیک بختی ذرا ملو

بول، کوئی سن لیا تو فوری مصیبت کھڑی ہو جائیں گی۔“

”تابی نے زبردستی ان کا ہاتھ منہ پر سے ہٹا کر اسی ڈھٹائی سے کہا۔“ اور

غائب صاحب کبھی میرے کو پسند کر لئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں انھوں کے حرم

میں زبردستی داخل کر لی جاؤں گی، اور ایک بیاہتا دو لہن ہو کر دوسرے کی دو لہن

کیسے بنوں گی۔ ویسے آپ تو بڑے مذہبی بنتے نا امی۔ مگر اب کیوں ہلو چپ رہ گئیں

بھلا یہ کوئی مسئلہ ہے کہ دو د مردوں کی لپچ بیوی؟“

”مگر بیٹا میرے کو یہ بتا اپنی بیٹیوں کو جانیں گے تو کیا بچ سکیں گے۔ کٹیاں تو ہر گھر کی ٹوہ لے لے کو پھرتیاں ہیں۔ کبھی نواب صاحب کو پتہ چل گیا کہ مراد میاں کی بیوہ ایسا اندھیر کرٹیں کہ جو ان بیٹی ہوتے ساتے مینا بازار کو نہیں لائیں تو اپنی تو بن موتا مر جائیں گے۔“

”جیسے بھی یہ زندگی بڑی اچھی ہے کیا کہ دوسروں کا مونہہ دیکھ دیکھ کو بات کرو۔ میں تو آج سوچ لے کو بیٹھی ہوں کہ جاؤ نیچ نیٹیں۔“

سکینہ بیگم سخت بے زار ہو بیٹھیں۔ ان کی عقل سے ہر شے بالاتر ہو رہی تھی کوئی مصیبت سی مصیبت تھی؟ اصل قیامت تو یہ تھی کہ مہتاب جو کڑوا حال جاہ کی اکیٹہ بن اور ہونہار طالبہ تھی اور ضرورت سے کچھ زیادہ ہی نڈر اور بے باک اس نے سیکھ بیگم کو پیار و محبت سے رام کر کے گزشتہ سال ہی دکھ لیں بھی اس کے چہرے کا چاند چمکا ہی تھا، چپ چاپ تے اپنے خالہ زاد بھائی طاہر سے شادی رچالی تھی۔ یہ شادی عرس کے موقع پر ہوئی تھی جب اطراف کی بکڑ بازی میں لڑکوں کو پاس پڑوس میں تانگ جھانگ کا ذرا کم ہی دھیان آتا ہے۔ اور ویسے بھی اگر کسی گھر میں ایک تانگے میں اندر کر چار پانچ آدمی ایک آدھو قاضی کو بٹھا کر لے آئیں تو یہ ایسی سنسنی خیز بات نہیں ہے کہ سب کی توجہ بٹ جائے۔ موٹر ہوتی تو الگ بات تھی۔ مگر شکرام اور تانگہ تو بڑی معمولی سی بات ہے! مہتاب تو چاہتی رہی کہ کسی طرح بلوہ پھوڑ کر بھی نکل ہی جائے۔ لیکن ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ پورے سال نواب صاحب کی مقرر کی ہوئی کٹیاں، لڑکیوں والے گھروں کی ٹوہ لیتی، پھرتی ہیں اور ایسے میں کسی کا شفت کر جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ سفر حضر کے لئے بھی ایک مرحلہ سر کرنا پڑتا تھا۔ اور خاص طور سے ان بے کس خواتین کے لئے

جو نواب صاحب کی عمل داری میں رہتی تھیں۔ جن کے خاوند کبھی نواب صاحب کے ملازم تھے اور جو بڑے وقتوں کے ہاتھوں بیوگی کی زندگی گزار رہی ہوتیں۔ سکینہ بیگم ان ہی میں سے ایک تھیں۔ طاہر نے ایک بار یہ تجویز پیش بھی کی تھی کہ چپ چپاتے نکل جائیں۔ اللہ کی اتنی بڑی دنیا میں کون کسے پہچانے چلا ہے۔ لیکن سکینہ بیگم لرز گئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ نواب صاحب کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ کہیں نہ کہیں سے کھونچ نکلوا بیٹیں گے۔ اور چرخی چکاری کے غلط سلط الزام میں اس طرح دھنسوا دیں گے کہ ساری عمر کچی چلاتے گزر جائے گی۔ وہ اپنا بڑھاپا خوار نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ صبح سے مرمر کر مہتاب سے یہی کہہ رہی تھیں کہ بس ذرا ایک گوٹے زری کا جوڑا پہن ڈال۔ بھلے سے ساج سنگار مت کر۔ ایسی کون سی عورت پر ہی ہے کہ نواب صاحب سمجھ ہی جائیں گے۔ سانولی سلونی صورت تو ہے۔ ہتھیلی بھر تیل لے کر سر میں چپڑ ڈال۔ ایسی اتری دال ایسی صورت دیکھ کر کیا آپے سے باہر ہوں گے۔؟ بس ذرا راہ داری سے گزرتے تک کی تو بات ہے۔ دنیا بازار کے دن نواب اپنی گدی والی زرکار آرام کرسی عین داخلے والی راہ داری میں رکھواتے تھے تاکہ بانغ شاہی میں داخل ہوتے ہی ہر صورت ان کے سامنے آجائے اللہ بڑا فیصلے میں آسانی ہے کہ یہ شکل اس لائق ہے یا نہیں کہ اسے زینت حرم بنایا جائے اور مہتاب کے غصے کا تو یہ عالم تھا کہ نواب صاحب کے یہاں سے بھجوا یا ہوا اگر ٹے کنارے کا جوڑا اس نے دوراٹھا کر پھینک دیا۔ اور اس بات کو سر نہ ہنسنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھی کہ معلانیوں نے کس صفائی اور نفاست سے ایسے کتنے سارے جوڑے تیار کیئے ہوں گے۔ اور حساب کی ماہر طالبہ ہوتے ہوئے یہ تک جوڑنے کو تیار نہ تھی ایسے ایک جوڑے پر اندازاً کتنی لاگت آئے گی۔

مگر جوابات ہوتی تھی وہ ہو کر رہی۔ مہتاب لاکھ سائلی سلونی تھی۔ تیل سے چٹری ہوئی تھی۔ لیکن نواب صاحب کی آنکھ بھی پیرے پر کھنے میں کچھ کم پار کھ نہ تھی، وہ سمجھ گئے کہ اس سائلی بدلی کے پیچھے کون سا چاند چمک رہا ہے انھوں نے تو سکینہ بیگم کو روک کر پیغام ٹھونک ہی دیا۔

دوسرے دن محل میں طلبی تھی، اسی رات طاہر میاں عمید کے لٹائیک ہفتے کی چھٹی پر آئے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی دیکھا کہ گھر میں ماتم پڑا ہوا ہے۔ تابانی پٹخ پٹخ کر اپنے کوبے حال کر لیا ہے۔ اور امینی الگ سوخت بنی بیٹھی ہیں۔ طاہر کہ جوان خون تھا۔ اور پہلی پہلی محبت کا شدید زخمی۔ چلا کر بولا "میں اس خبیث بڈے کو قتل کر دوں گا۔"

سکینہ بیگم نے ہول کر اس کے مونہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اے بیٹا پاس پڑوس کا تو کچھ خیال کرو۔"

"جی نہیں خالہ جان، یہ عیاشی اور ظلم کی انتہا ہے، میں بھی سمجھ لوں گا آج کی آخری گاڑی سے ہی تابانی کو دہلی لے کر نہ چلا جاؤں تو اپنے باپ کی اولاد نہیں بیٹھے ہیں۔"

"یا تو نواب صاحب نہیں یا میں نہیں"۔ وہ جذبے میں آکر بولا بڑے رمان سے سکینہ بیگم بولیں "میرے مونہ میں خاک کیا تھا اے نیٹس ہونے سے یہ سلسلہ ختم ہو جائیگا کیا؟ تم اکیلے اپنی جان سے چلے جائی گے میاں اور کیا ہوئیں گے؟"

"مگر خالہ جان۔۔۔ طاہر رو رہا تھا ہوا کٹا۔۔۔" اللہ نہ سوچے کس قدر

ذلیل بات ہے کہ سال بھر اپنی عمل داری میں عورتیں بھجوا بھجوا کر ٹوہ لگوائی جائے کہ کون کون سے گھر دل میں لڑکیاں بالغ ہو رہی ہیں اور پھر ایک بازار منعقد کروا کے لڑکیاں پسند کی جائیں۔ اور جبراً انھیں اپنے عقد میں لے لیا جائے اور پھر سال بھر بعد ان کا رس چوس کر پھوک بنا کر مذہب کے نام پر طلاق دے کر چلتا کر دیا جائے۔ اور پھر نئے نئے پھول، باغوں سے چنے جائیں، حد ہو گئی حد! " ایک دم وہ پاگلوں کی طرح چلا اٹھا " میں تابی کو کہیں نہیں جانے دوں گا وہ میری ذہن ہے۔ "

سکینہ سلیم بڑے سکون سے بولیں۔ " ایسے چنیاں نکو مار دیاں۔ میرے اُتا حوصلہ نہیں کہ نواب صاحب سے ٹکرموں لیوں۔ " وہ جل گیا۔ " میں آپ سے ٹکر لینے کو کب کہتا ہوں؟ تابی میری بیوی ہے بھگت لوں گا۔ "

تابی اس بحث کے دوران میں خاموشی سے بیٹھی رہی۔ اس کا وہ سارا طنطنہ اور تیہا مینا بازار سے داپسی پر ہی جیسے ختم سا ہو کر رہ گیا تھا ہر کے آخری نعل پر وہ چونکی اور دھیرے سے بولی " اللہ طاہر آپ ایسے باتاں نکو کرو۔ آپ میرے واسطے کاٹے کو بھگتو۔ میں آنچ اپنی جان ختم کر لیتیوں۔ نہ بانس ہے گا نہ مہرنی بچیں گی۔ "

" ارے ماہ! طاہر تپے ہو شے لمبے میں بولا۔ " گویا انسانی جان کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ ایسے کیسے تم اپنے آپ کو ختم کر دو گی؟ وہ جیسے ساس کی موجدگی سے بے خبر ہو گیا۔ " یہ تمہارا پھول ایسا لوزین بدن جس پر میرے بوسوں سے بھی نیل پڑ جاتے ہیں، جس نے ابھی مانتا کا خوشگوار بوجھ بھی نہیں اٹھایا۔ جس کو ابھی

میری بانہوں کے شکنجے میں ٹھیک سے کنا بھی نہیں آیا۔ وہی پھول ایسا نازک بدن اس خبیث کی آغوش میں؟ تھو تھو — میں ایک بار مل کر پہلے تو سمجھاؤں گا اور پھر....“

وہ کہتا گیا — تابی سنتی گئی۔

عید میں تین دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ سحری کے بعد مرزا صاحب نے ذرا سونا چاہا، مگر آنکھ نہ لگ سکی، کاموں کا اک انبار ان کے سر پر سوار تھا۔ نوزل کی صفائی — دُہری صفائی — ایک تو کچرا جھاڑ جھنکار۔ مگر یوں کے جلے صاف کرانا، گرد اڑانا۔ وغیرہ، اور دوسری صفائی یوں کہ رہی سہی پرانی بیگمات کو نکھانا — پھر نئی بیگمات کے لئے پوشاکیں سلوانا، ”لاڑ بازار“ کے بار بار چکر مارنا کہ نگوں کے چوڑیوں کے جوڑوں۔ مستی افشاں سے لے کر منہدی، سالوں تک کی برابری کرنا۔ پھر خود کی دھونی میں پوشاکوں کو بسانا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ نواب صاحب ان معاملات میں مغلانیوں تک پر اتنا بھروسہ نہ کرتے جتنا مرزا صاحب پر۔ وہ بھی اصل میں برسوں سے یہ فریضے انجام دیتے دیتے مجھ گئے تھے۔

صبح ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے کو تھی۔ انھوں نے اٹھ کر فجر کی نماز پڑھی اور ذرا لیٹے ہی تھے کہ دروازے پر کھٹکا ہوا — وہ ذرا حیران بھی ہوئے — اس وقت کون ان سے ملنے آیا ہوگا۔؟ پھانک پر چادش نے روکا بھی نہیں آتے والا سیدھا میرے کمرے تک چلا آیا۔ سب جانتے ہیں کہ یہ وقت میرے آرام کا ہوتا ہے۔ ذرا دُبدھے کے ساتھ انھوں نے دروازہ کھول دیا۔

دردازے پر ایک خوبصورت تنومند جوان لڑکا کھڑا ہوا تھا وہ ذرا معذرت کے ساتھ بولا۔

”مجھے معاف کیجئے، آپ کے آرام میں مغل ہوا۔ لیکن بات ہی کچھ ایسی ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ نواب صاحب تک آپ کی بہت رسائی ہے۔ کیا آپ مجھے ان سے ملنے کا ایک موقع دلوا سکیں گے؟“

مرزا صاحب اتنی لمبی بات سے ذرا خائف ہو گئے وہ لکھ کر مگر ضبط سے بولے۔ ”میاں تم ہو کون؟ آئے کیوں؟ کام کی نوعیت بولے نہیں، میں کیسے نواب صاحب سے آپ کو ملا دیوں؟“

جی میں ایک غریب طالب علم ہوں۔ وظیفے وغیرہ کے سلسلے میں باریابی چاہتا ہوں۔“

مرزا صاحب نے ایک دو لمحے توقف کیا، کچھ سوچا، پھر اٹھیں خیال آیا کہ، رمضان کے پورے مہینے نواب صاحب کا ہاتھ اونچا رہتا ہے۔ روزانہ ایک طشت چاندی کے روپوں سے بھرا غرباء میں جب تک بانٹ نہیں لیتے روزہ افطار نہیں کرتے ویسے بھی ان کا فیض جاری ہی رہتا ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی ضرورت مند ہو اور سی لٹے وقت چلا آیا ہو کہ یہ در، خدا کے دے کے بعد ایسا در ہے، جہاں سے کوئی سائل خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔ وہ ذرا دیر بعد بولے اچھا تم بیٹھو۔ نواب صاحب تلاوت قرآن کے بعد ہی حاجت مندوں سے ملتے ہیں مگر میرے بولنے میں کیا مضائقہ ہے۔؟“

طاہر انکسار کے ساتھ بولا۔ ”مضائقہ تو کوئی نہیں، لیکن میری آرزو تھی دیرینہ تمنا کہیے کہ نواب صاحب کے نیاز حاصل کروں، بس اسی لئے....“ وہ ہاتھ ملنے لگا۔

”اچھا اچھا، کوئی مضائقہ نہیں۔“ اور وہ بھاری چٹاٹھا کر زنان خانے

میں چلے گئے۔

نواب صاحب نے سر سے پاؤں تک طاہر کو دیکھا اور کچھ مسکرائے۔
 طاہر اپنے کالج کا بہترین اسپیکر تھا، وہ بغیر کسی جھجک کے شروع ہو گا
 ”مجھے حضور سے ملنے کی بہت تمنا تھی۔“ وہ کچھ مسکرایا۔ ”اور مجھے اس کا
 یقین تو کیا گمان تک نہ تھا کہ میں کبھی آپ سے مل بھی پاؤں گا۔ آپ کی سخاوت
 کے قصے بے حد سننے میں ہیں۔۔۔۔۔“

نواب صاحب ذرا ناگواری سے بولے۔ ”میاں لڑکے جو کچھ تم کو مانگنا
 ہے مانگ ڈالو، ہمارے آرام کا وقت ہے۔“

”حضور سرکار۔“ طاہر حاجت سے کورے لہجے میں بولا:

”بس ایک ہی مانگ ہے کہ آپ مہتاب کو میرے حق میں چھوڑ دیں۔ وہ
 میری منکوحہ ہے۔“

نواب صاحب سناٹے میں آ گئے۔ دنیا کے کسی قانون میں کوئی دفعہ
 ایسی نہ تھی جو وہ یہ سوال بھی کر سکے کہ کس کی اجازت سے تم نے مہتاب سے
 شادی کی۔ کافی دیر بعد انھوں نے ایک ہی سوال کیا۔ تمہیں معلوم ہے لڑکی بالغ
 نہ ہو تو شادی، ہمارا مطلب ہے کہ نکاح فاسد ہو جاتا ہے؟

”لیکن تابی تاباغ تو نہیں تھی، جب میں نے اس سے شادی کی۔“

”نگہ روں جیسی آنکھوں سے انھوں نے طاہر کو گھورا۔ بہت لمبے
 ہاتھان میں میاں تمہارے؟“

تھوڑی دیر بعد وہ جذبات سے عامی لہجے میں بولے۔ ”اچھا ہم بعد
 میں سوچے کو بروں گے۔ ابھی تو تم ہمارا ایک کام کر دو۔ یہ گھڑی ذرا برابر

نہیں چل رہی۔ چوک کے پاس جو گھڑی ساز کی ایک بڑی سی دکان ہے وہاں بنانے کو دے دیو۔ پر نہ لکھو سنبھال کو لے جانا، اس کی چین اصلی ہیروں کی ہے۔“ اور انہوں نے گھڑی طاہر کے ہاتھ میں تھما دی۔

جیسے سی راہ داری سے ہوتے ہوئے طاہر ابھی محل کے پھاٹک تک بھی نہ پہنچا ہو گا اگر کئی مہینو طاہر انہوں نے اسے بڑی طرح جکڑ لیا۔ اس نے ہڑ بڑا کر ادھر دیکھا چار، چھ سیڑھیاں اوپر نواب صاحب اور مرزا صاحب کھڑے تھے۔

نواب صاحب نے مسکرا کر مرزا صاحب سے کہا، ”امین صاحب (پولیس) سے بولو بے چارہ روزے سے ہو بیٹا گا، مار پیٹ کی ضرورت نہیں بس ”چار دیواری“ کافی ہے۔“

مرزا صاحب گرج کر بولے ”مگر حضور ہیروں پر ہاتھ صاف کرنا کوئی معمول جرم ہے؟ اور وہ بھی حضور کی خاندانی گھڑی۔“
مگر جب تک حضور پلٹ کر جا چکے تھے۔

مہتاب نے نکاح کے رجسٹر پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا نواب صاحب مذہبی معاملوں میں جوہر، جبر اور زیادتی کے قائل نہ تھے وہ سنان سے مرزا صاحب سے بولے ”لوٹکی کی رضا کے بغیر نکاح کیسے ہو سکتا ہے؟ پر لوٹکی ہم کو بہت پسند آگئی ہے۔ اس واسطے آپ ایسا کرو کہ اس کو چند روز کے واسطے بھرپور عیش فراہم کر دو کہ وہ روپے پیسے کی ریل پیل دیکھ کر راضی ہو جائے۔“
”پر حضور۔۔۔ آپ سُننے نہیں، وہ نو چلا چلا کر یہ بھی کہہ رہی تھی کہ میں شادی شدہ ہوں۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ اور حضور پہلا شوہر ہوتے ہوئے

دوسرا نکاح تو خطعاً (قطعاً) ناجائز ہے۔“

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ محض ایک چال ہے۔ بہر حال آپ دخت کا انتظار کرو۔“

دوسرے دن نواب صاحب کو یہ اطلاع پہنچائی گئی کہ تابی کو زیر کرنے کے لئے جس عیش کے فراہم کرنے کے بارے میں مرزا صاحب کو ہدایات دی گئی تھیں بے سود رہا۔ مرغن کھانوں کو تو اس نے دھڑا دھڑا اٹھا کر پھینک دیا اور بھاری زرتار ریشمی پوشاک کو پھاڑ پھوڑ کر اس نے دھجیاں بکھیر دیں اور اب نگلی بیٹھی ہوئی ہے۔“

”نگلی!“ نواب صاحب نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ مگر دزے کا لحاظ کر کے سنبھل گئے۔

”کوئی بات نہیں۔ اس سے پہلے دو ایک خود سر جھوکریاں اور بھی ایسے تماشے کر لے کہ ہم کو حیران کئے تھے۔ پر دخت سب کو سنبھال لیتا ہے۔“

عید کا چاند چمکا۔ مسجدوں میں منادی ہو گئی کہ کل عید ہے۔ آج سے تہذیب موقوف کی جاوے۔ نور منوں میں چاندنی چمک چمک بھٹی ایک ایک گوشہ بقیۃ نور بننے لگا۔ غشاء کی نماز کے بعد بھی نواب صاحب لیٹے ہی تھے کہ مرزا صاحب ہاتھ جوڑتے ہوئے آئے۔

”حضور، وہ گھڑی چور۔“ نواب صاحب نے ہمت بندھائی

”وہ تو مر گیا!“

”مر گیا۔؟“ نواب صاحب ذرا حیرت سے بولے۔ ”اتنا دن نکلا کہ

چار کوڑوں کی مار سے مر گیا۔؟“

”جی نہیں سرکار۔ وہ ادپری کھڑکی کے سلاخاں پتہ نہیں کیا کر کے

توڑا اور نکل کر کودنے جا رہا تھا کہ غلطی سے ایسا ہونڈے (اندھے) موہہ گرا کہ

دھینچ دم نکل گیا، اس کا۔ کھڑکی بہت اونچی تھی تا سرکار!

نواب صاحب اطمینان سے لیٹ گئے۔ ”تو اس میں ہمارا تو کوئی قصور

(قصور) ہی نہیں، اپنی موت مرا، ہماری گردن پر تو خون ناحیہ نہیں ناپا“

”جی نہیں سرکار۔ بھلا آپ کا کیا قصور۔ میں تو خالی حضور

کو اطلاع دینے حاضر ہوا تھا۔ ایک کانٹا آپ کی نکل گیا۔ اگر داخلی وہ مہتاب

بیگم کا شوہر تھا تو بھی اب تو قصہ (قصہ) ہی ختم ہو گیا۔

”بس اللہ ہم پر مہربان ہے۔“

دوسرے دن عید تھی، نواب صاحب نماز عید کے لئے عید گاہ روانہ ہوئے

ہی والے تھے۔ ایک پاؤں نگھی کے پائیدان پر تھا اور ایک زمین پر، کہ اندر سے مزا

صاحب سرا سیمہ سے وارد ہوئے

”حضور غضب ہو گیا۔“ مہتاب بیگم بھی انتہا فرما گئیں۔

نواب صاحب ایک لمحے کو سرا سیمہ سے ہو گئے۔ وہ کیسے۔؟“

حضور اُنھوں کے ہاتھوں میں جو کا پخ کی چوڑیاں تھے نا اس پر کسی کا

دھیان نہیں گیا۔ وہ انوں میں کرکھا ڈالے۔“

نواب صاحب نے نگھی میں بیٹھ کر اطمینان اور سکون کے ساتھ دونوں

ہاتھ اللہ کے حضور میں اٹھائیے۔

”میں خیر (حقیر) بندہ کس زبان سے تیرا شکر ادا کروں خدا کی تو نے

مجھے گناہ میں نہیں ڈالا۔ ورنہ حشر کے دن میری گردن پر خونی ہونے کا جوار کھا جاتا۔“

پھر وہ مرزا صاحب سے بولے۔ ”کم بخت مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور مذہب سے یہ لاعلمی! معلوم نہیں کہ خود کشی کتنا مذموم فعل ہے۔ جس کی اللہ کے پاس کوئی معافی پرچ نہیں۔“

سامنے ایک خدمتگار، چاندی کے طشت میں سونے کی اشرفیاں لٹے کھڑا تھا کہ ہر عید کو حضور کا دستور تھا کہ جب تک غریبوں کو خیرات نہ بٹ جاتی وہ کہتے عبادت قبول نہیں ہوتی ان کے طشت کو ہاتھ لگاتے ہی کوچ بان نے سونٹا ہوا میں لہرایا اور سکوں کی برسات میں دعاؤں میں شرابور نواب صاحب کی گھٹی عید گاہ کی طرف روانہ ہو گئی۔

شادی

”بی بی - پانی نہایو - میں حمام تیار کر دی -“
 صندل نے دبے پاؤں آکر جہاں بانو کو اطلاع دی - مگر جہاں بانو اس
 وقت چھپر کھٹ پر اوندھی لیٹی مزے مزے میں ٹانگیں ہلا ہلا کر کوئی چٹ پٹاسا
 ناؤں پٹھ رہی تھی - صندل کی بات جیسے اس کے کانوں میں پڑی ہی نہیں -
 جب صندل نے دوبارہ کہا ”بی بی پانی ٹھنڈا ہو جائیں گا -“ تو جہاں بانو اٹھ
 کر بیٹھ گئی - ایک ہاتھ سے کتاب دور پھینکتی، دوسرے ہاتھ سے صندل
 کو اپنے بستر میں گھسیٹتی بولی ”اگر صندل تیرے کوئی کاوا سٹھ - میرے کو
 روز روز یہ مصیبت میں مت ڈالا کر، -“
 صندل دیدے پھاڑ کر بولی ”بی بی پانی نہانا مصیبت ہے۔“

”صندل“ وہ کھلکھلائی ”آج میرا دل نہلنے کو بالکل نئی چاہ را۔ میرے
بدلے تو آئین مل کو موگرے ملے پانی سے نہالے۔“
”ہو نہا کو؟“ صندل مسکرائی۔

”نہا کو آج تو اپنی سیج سجالے۔“
”کمرہ جوان ہنسیوں سے کھبہ کھیر گیا۔“

”نکو نکو۔“ میرے کو معاف کر دیو۔ صندل ہنستی شرماتی ہوئی بولی
”یہ نہالنے دھونے آپ کو اچ مبارک۔“

سارا سلسلہ یہ تھا کہ جہاں بانو، جس کی شادی کو — سال بھر سے
بھی زیادہ ہو چکا تھا۔ جب بھی میکے آتی: ”مما جانی“ اس کے وہی چاؤ چرچلے
کرتیں۔ جونئی دلہن بننے والی لڑکیوں کے ہوتے ہیں کہ رات ہی سے سردھونے
کے لئے مسالہ بھگویا جارہا ہے۔ شیکا کاٹی ابل رہی ہے۔ جسم دھونے کے لئے
ابٹن چکے کی تیاری کا حکم صادر کیا جارہا ہے۔ دامادوں کو خوش ایک طریقہ یہ بھی
تو ہے کہ بیٹیوں کو خوشبوؤں میں مہکا کر، عطر پھیل میں بسا کر پیش کیا جائے۔
اس خدمت پر ہمیشہ صندل مامور کی جاتی۔ کہ وہی بچپنے سے جہاں بانو کی دل لگ
سہیلی تھی۔ جہاں بانو سے اس کی خوب بڑی تھی اور خود اسے بھی ان بی بی کا کام
کرنے میں بہت مزہ آتا،۔ جہاں بانو تو اسے کسرال بھی ساتھ ہی لے جاتا
چاہتی تھی، مگر ”مما جانی“ نے سوچا کہ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے اپنے ہاتھوں
بیٹی پر سوکن بٹھادی۔ ویسے جب بھی جہاں بانو آتی وہی اس کی پیشوائی اور
پیش خدمتی کو حاضر رہتی۔ دونوں ماکن اور نوکرانی کم، سہیلیاں زیادہ لگتیں۔
اسی مارے نوکروں کی پلٹن جلن سے مرجاتی تھی۔

اگے صندل — جانو کو ہنلا دی کہ نہیں؟ ” پرے صحن سے بڑی بیگم کی قریب آتی آواز سے ہوا کہ صندل نے کمرے کا دروازہ دھڑ سے بند کر لیا ” ایتھ بی بی — خدا کے واسطے جلدی سے گھس کو حمام کا دروازہ بند کر لیو جی۔ نہیں تو بڑی پاشا میرے کو کتناڑ چیں گے کی بولا ہوا کام بھی نہیں کرتی؟ ” اللہ یہ بھی کوئی زبردستی ہے جی۔ کیا روز روز نہانا فرض ہے؟ جا بول نے میرے کو بخار ہے۔ میں نہیں نہاتی۔۔

” وہ مار بھی میرے اوپر ارج پڑیں گی نا۔ بڑی پاشا بولیں گے نہیں کہ جب معلوم تھا کی بچی کو بخار ہے تو سالے ابٹنے کاٹے کو کھگائی، ہور میں تو ابٹن میں عطر بھی ملا کر رکھ دی ہوں۔ سب شخصان (نقصان) ہو گیا نا۔؟ ”

کہتے فضیل باتاں کرٹی صندل تو — جب اتنا ڈر ہے تو تو خود نہالے میں بول دیوں کی میں نے نہالی۔ تیری بھی بات رہ جائیں گی۔ میری بھی — ” اور جہاں بانو نے صندل کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور اٹھیٹا ہاتھ روم کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیل دیا۔

کھوڑی دیر تک تو جہاں بانو ناول پڑھتی رہی پھر چپکے سے اٹھ کر باہر والے میدان کی طرف ہوئی۔ جہاں اس کے میاں اور اس کے بھائی دونوں ہی بچوں میں بچہ بنے، گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔

صندل نے عطرے ابٹن سے اپنے جسم کو کیا ملا کہ جیسے انگ انگ کو دینے لگا۔ زعفران اور ملہری والے چکسے سے جلد کی رنگت سونا بن کر دیکھنے لگی۔ سونا چاندی لٹھکاتے جسم پر آگے پیچھے بالوں کی ٹیش موتی برسائے لگیں۔ اپنی،

خوشبوؤں سے آپ مست ہونے والی ہرنی کی طرح اس نے کھوٹی کی طرف اپنا سونے کا ہاتھ بڑھا یا۔ ایک دم اس کو گھن سی آئی۔ اتنے عطر مسالے چکے سے نہا کو پھر وہی کے وہی کپڑے پہن لیوں؟ جی! اصل میں جہاں بانو نے اسے ایسی جاہلی میں غسل خانے میں ڈھکیلا تھا کہ اسے واپس جا کر کپڑے لانے کی بھی سوجھ بوجھ نہیں رہی تھی۔ اب نہانے کے بعد خیال آیا تو کیا آیا؟۔ اس کی کوٹھری تو کافی دور تھی۔ چلو یہ دوپٹہ لپچا اور ٹھک کو چلی چلوں۔۔۔ ویسے بھی اس وقت زنان خانے میں آنے والا کون تھا۔؟

ہاتھ کا رنگا گلابی مٹل کا دوپٹہ جو اس نے ابھی ابھی اتارا تھا۔ سارے بدن پر لپیٹ لیا۔ گیلے بدن سے لگتے ہی دوپٹے یوں چپک گیا۔ مانو کسی نے گوندھ سے مڑھ دیا ہو۔ گلابی مٹل نے بدن سے لپٹ کر جیسے اسے شراب کی چھلچھلائی بوتل بنا دیا۔ دروازے کے پاس جڑے ہوئے قد آدم آئینے میں اس نے اچھتی نظروں سے اپنے سر پے کا جائزہ لیا تو اسے چکر سا آگیا چکراتی، ڈولتی، اپنے آپ کو سمجھاتی جب وہ حمام سے نکل کر جہاں بانو کے کمرے میں آئی تو کلیجہ دھڑ سے اڑ کر جیسے حلق میں آٹکا۔

اندر سے چٹخنی لگاٹھے، دروازے سے پیچٹ نکاٹھے یوسف پاشا کھڑے تھے! ہر چند کہ یوسف پاشا بے حد شریف مہم کے آقا تھے۔ نوربانو جہاں بانو، کے بڑے بھائی ہونے کے ناطے اس کے ساتھ بھی ہمیشہ بڑا شفقتاً برتاؤ رکھتے تھے، کبھی کبھی جب نوربانو اور جہان بانو کے لئے تحفے لاتے یا عیدوں پر چھوٹوں کو عیدی دیتے تو اس کے ہاتھ میں بھی عیدی ضرور کھتا دیتے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے یہ کب کہا تھا کہ میں مرد نہیں ہوں۔

یوں آگ اگتی جوانی سامنے دیکھ کر وہ بری طرح سٹیٹا گئے۔ ہڑبڑا کر بڑے
 "میں گلی ڈنڈے میں مار گیا تھا۔ داؤں دینا جان پر آیا تو یہاں آکے چھپ
 گیا۔ میرے کو معلوم نہیں تھا..... وہ الفاظ ڈھونڈتے رہ گئے۔
 صندل کے دونوں ہاتھ یکبارگی اٹھے کہ کچھ چھپالیں۔ لیکن چھپانے کی کوشش
 میں وہ تو مجسم دعوت بن گئی۔ ویسے بھی موٹی ملل کی ادقات ہی کیا؟
 یوسف میاں نے آج تک شراب نہیں چکھی تھی۔ بس کالج سے حویلی۔
 حویلی سے کالج۔ بہت ہوا تو اپنے یار دوستوں میں بیٹھ کر کمرے کا دروازہ بند
 کر کے "بابا حضور" کی نگاہوں سے بچ کر تماش کے پتے کھیل لئے۔ لیکن
 آج انھیں اچانک احساس ہوا کہ شراب کا ذائقہ زبان اور ہونٹوں سے نہیں
 آنکھوں سے بھی چکھتا جاتا ہے۔ آج سے پہلے بھی ایک بار صندل نے ایسے
 ہی گیلے بدن کی آنچ سے انھیں جلانے کی کوشش کی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ وہ
 بیچارے اپنے دھن میں ناک نیچی کئے سیدھے زنان خانے میں چلے گئے۔
 وہاں چھوٹے کمرے میں صندل اپنی شلوار کے پائینچے گھٹنوں تک اوپر چڑھا
 شیشے کی پنڈلیوں پر کسی بی بی کے ننھے بچے کو لٹائے پیرس سوپ سے نہلا
 رہی تھی۔ بچہ تو نہلا یا ہی جا رہا تھا، خود صندل بھی بھیاگ کر چڑیا بن گئی تھی۔
 دوپٹہ اتار کر اس نے الگ پلنگری پر ڈال رکھا تھا۔ پائینچے تو تھے ہی گھٹنوں
 سے اوپر جھک کر نہلاتے میں کالے کرتے کی بٹن پٹی سے چاند سوزج الگ
 جھلکے پڑ رہے تھے۔ کیا چھپا تھا اور کیا ڈھکا تھا۔ یہ تو وہی جانے جس نے
 تاک جھانک کی ہو۔ جلے پاؤں کی بلی کی طرح وہ وہاں کھڑے ہی کب تھے
 کئی دن تک پیرس سوپ کی جان بیوا خوشنواں کے حواس پر چھائی رہی۔

پڑھنے بیٹھتے تو کتا ہیں پیرس سوپ بن جاتیں لکھنے بیٹھتے تو قلم پیرس سوپ بن جاتا۔ ساری دنیا کی خوشبوئیں جیسے ایک پیرس سوپ کی خوشبو پر نثار عقیں۔ بڑی مشکلوں سے کالج میں پڑھنے لکھنے میں جی لگایا۔

لیکن آج۔۔۔؟

پیرس سوپ کی وہ بہان یوا مہک مجسم ان کے سامنے کھڑی تھی، بال بال سے قطرہ قطرہ ٹپکتا خوشبودار پانی۔ چمکتے کالج اور شیخے کو است دینے والی کھلی پنڈلیاں۔ رگڑ رگڑ کر ہنلایا ہوا گلابی دیکھا دیکھا جسم۔ ملل کے ایک حقیر سے گلابی دوپٹے نے کس کر سمیٹ رکھا تھا۔ اور پھر انگاروں کی طرح رہتے سرخ ہونٹ۔!

یہ اپنی جگہ سہمی ہوئی۔ وہ اپنی جگہ ہمت کرتے ہوئے پتر نہیں کتنی دیریوں ہی گزر گئی۔ بچتے ہوئے جسم کی حدت سے ملل کا دوپٹہ یہاں وہاں سے سوکھنے لگا۔ گلابیاں نکھرنے اور مزید پاگل کرنے پر کمر بستہ ہو گئیں۔ سانولے رنگ میں کیا خاص بات ہے، بہتوں کا ہوتا ہے۔ مگر اس کمبخت کے سانولے پن میں جو دمک ہے، جیسے جسم میں کسی نے سونا پگھلا کر اندر بھردیا ہو۔ وہ دمک رہ رہ کر بے قابو ہو جانے پر ابھارتی ہے۔ یز سب میاں حواس ہوتے ہوئے بھی پاگلوں کی طرح چھپٹے۔ صندل کو دندن ہاتھوں پر پھریوں کی طرح سنبھال کر چھپرکھٹ پر لا کر یوں رکھا جیسے تو بیا ہی دلہن ہو۔

”صندل..... صندل....“ مذہم اندھیرے والے کمرے میں

ان کی ڈوبی، ڈوبی آواز ابھری۔ ”میں تمہارے ان بالوں میں جن سے خطرہ خطرہ

پانی ٹپک رہا ہے ایک ایک میں سچا موتی پرودیوں گا۔ میں تم پر سے خرابان ہو جاؤں گا۔ صندل آج کے بعد کبھی تم کو الگ نہیں کروں گا۔ میں سچی بولتا ہوں صندل میں تم سے شادی کریوں گا۔“

صندل کچھ نہ بولی۔ بولتی کیا؟ یہ وقت تو حلی میں پہننے والی ہر پالکڑی ہر نوکر لڑکی، ہر ملازمہ پر آتا ہی تھا۔ یوسف پاشانہ ہوتے، کوئی اور ہوتا۔ بکریوں کے گلے میں سے کوئی نہ کوئی بکری کسی نہ کسی بھیڑیٹے کا نوالہ بنتی ہی۔ لیکن اس کے کانوں میں جیسے رس سا ٹپک رہا تھا۔ ”میں سچی بولتا ہوں صندل میں تم سے شادی کریوں گا۔“ (کم سے کم یہ الفاظ تو آج تک کسی اور خادمہ کے کانوں کا مقدر نہیں بنے تھے)

لیجے چوڑے چھپر کھٹ پر حیدر آبادی نگوں کے جوڑے کا ایک۔ گوٹے ٹوٹ ٹوٹ کر ٹکڑے ہو گیا۔ یوسف میاں نے ٹوٹے ہوئے گوٹے کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اپنی جیب میں رکھا، مڑی تڑی صندل کی ٹھوڑی اٹھا کر بڑے پیار سے بولے ”آج کے پیارے دن کی یادگار۔“ یہ ٹوٹی ہوئی چوڑی۔ اس کو میں سدا اپنے دل کے پاس والے جیب میں رکھوں گا۔“

انھوں نے پہلے تو ذرا سادہ روزہ کھول کر چھری سی بنا کر دیکھا کہ کوئی ہے تو نہیں۔ جب میدان صاف پایا تو ہوا کے بھونکے کی طرح کمرے سے۔ اور صندل کی زندگی سے نکل گئے۔

تھے تو یوسف میاں کھائی بہنوں میں سب سے بڑے۔ لیکن شادی ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ بابا حضور نے بیٹیوں کا دونوں کا بیاہ کر دیا تھا۔ لڑکیوں کو پڑھ لکھ کر کون سی نوکریاں کرنی تھیں۔ مگر لڑکوں کی تعلیم تو پوری ہونی

ہی چاہیے۔ اسی لئے انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ جب تک یوسف پاشا بیٹے نہ کر لیں، شادی کی بات سوچیں گے بھی نہیں۔ منگنی و نکاحی کے وہ قائل نہیں تھے خواہ مخواہ اٹکا کے چھوڑ دیتا انہیں سخت ناپسند تھا۔ لڑکے لڑکیوں کا کال نہیں پڑا تھا۔ بس انسان ارادہ کر لے۔ ایک چھوڑ ہزار موجود ہیں۔ بیٹیوں کے کے بھی انہوں نے چٹ منگنی پٹ بیاہ کئے تھے۔ حالانکہ بڑی بیگم ہاں، ہاں کرتی ہی رہ گئی تھیں کہ اتنی جلدی پیغام آیا بھی جنول بھی کر لیتے۔ نہ دیکھے نہ بھالے۔ مولا معلوم کیسے لوگاں بیٹے۔ کیا بیٹے۔ مگر بابا حضور سنتے سب کی تھے، کرتے دل کی۔

اور اب یوسف میاں کابی اے کا نتیجہ آتے ہی انہوں نے ان کے لئے بھی رشتہ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ سلامت یار جنگ کی بیٹی ان کی بچپن کی رہ بھی بھالی تھی۔ اللہ جانے اس گھرانے پر کیا اللہ کی مارتھی کہ ایک بھی شکل ڈھنگ کی نہ تھی۔ نوابوں کا گھرانہ تھا مگر صورتیں دیکھو تو چاروں کی۔ لیکن ان کی سب سے چھوٹی بیٹی زینبا جیسے راستہ بھول کر اس گھر میں آنکلی تھی۔ چاند سا مانتھا۔ کمر تک ٹٹکتے ہوئے چھوٹے ہی سی، مگر خوب گھنے بال۔ کنچوں کی طرح سبز آنکھیں، دودھ سے دھلی رنگت، — اور قد و قامت اس قدر موزوں اور سبک کہ خدا ہی ایسی مورتی گھڑ سکتا تھا۔ — انگلش اردو سب پڑھی لکھی تھی، اور پھر یہ کہ لاکھ بابا حضور حیدر آباد بھر میں اعتماد الدولہ شمار ہوتے تھے، اور اشرافیوں پر چلتے تھے۔ مگر آتا ہوا پیسہ بھی کسی کو برا لگتا ہے۔ سنا گیا تھا کہ ایک ایک بیٹی کے نام سلامت یار جنگ نے دودھ والا کھڑپے نقد نقدی جمع کر دی ہے۔ اور اوپر سے دامادوں کے گھوڑے، جوڑے الگ۔ دان

دہیز، زیور، کپڑا، لٹا جاتا، ماما جانی کا سر نہیں پھرا تھا کہ وہ خواہ مخواہ بڑے نواب کی رائے رد کرتیں۔ جب بھی کچھ برابر تھا تو عہلا شادی میں دیر کیوں ہوتی۔؟ حویلی میں وہ آیا اتر رہی ہیں، یہ حالہ جارہی ہیں۔ رشتے نلے کی مائیاں، تائیاں چچیاں سب جمع ہونے لگیں۔ بڑے تام جھام سے پیام لے جایا گیا۔ سلامت بار جنگ جیسے سوچے ہی بیٹھے تھے کہ کب پیام آتا ہے اور قبول کرتے ہیں۔ ہاں کا جواب ملتے ہی شادی کی تیاریاں شباب پر آ گئیں۔

اتنے سارے دنوں میں پھر بھی یوسف پاشا جا کر زنان خانے میں جھانکے نہ صندل سے ان کی ملاقات ہی ہوئی اور سچ تو یہ ہے کہ کبھی ان کو خیال نہ آیا کہ کوئی ان کے ایک دھڑے پر اپنی زندگی تک مار بیٹھا تھا۔ وہ تو اس واقعہ کو اس طرح بھول گئے تھے جیسے کوئی بے حد شدید بھوک میں ڈٹ کر کھانا کھالے، اور سیر ہو جائے

اب مہینوں گزر جانے پر یہ کب یاد رہتا ہے کہ بھٹی کب بھوک لگی تھی اور کیا کھایا تھا مرد تو وہی جو کھائے پیئے اور بھول جاٹے۔ لیکن ادھر صندل، جیسے ساری دنیا سے ٹکرتے لینے کو تیار بیٹھی تھی۔ پیاموں کی اس کے لئے کمی کب تھی۔ تھی تو وہ حویلی کی پاکڑی چھو کر ہی گر چھے اچھوں نے ماما جانی کے پاس اس کے لئے پیغام بھجوائے تھے۔ جوانی کو پیچھے ڈال دہ تو ندریا پر بھی آتی ہے تو اسے سندریا بنا دیتی تھتے۔ صندل کی تو تھی ہی قاتل جوانی۔ مگر نوکرانی ہونے کے باوجود اس کا جو رکھ رکھاؤ، جو سلیقہ اور جودل سمیت لینے دینے کے انداز تھے۔ وہ اسے بیگیوں میں بٹھانے کے قابل بناتے تھے۔ بابا صفور کی بیٹیوں کے سلیقے، ماسٹروں اور ستانیوں سے تھوڑا بہت نکھنا چڑھنا سیکھا۔ وہ انکے پھر سنا جہاں بانو نور بانو کی اترن پہنی

جو برائے نام ہی اُترن ہوتی۔ ایک سے ایک عمدہ ریشمی جوڑے، غرارے
 شلواریں۔ تنگ پاجامے، کھڑے گلے کرتے، نیچے گلے کی کُرتیاں۔ فیشن
 تو ان بہنوں پر ٹوٹ کر سوار رہتا تھا۔ اور ان سب کی حصّہ دار صندل بھی
 بنتی۔ ایسے میں اس کا حسن اور بھی گمراہ کر دیتا۔ ماما جانی کی ایک رشتے کی بہن
 نے تو اس کے لئے باقاعدہ پیام بھی بھجوا دیا تھا۔ ان کے بیٹے کسی عید پر سلام
 کرنے خالہ کے یہاں آئے تو سینی میں سوٹیاں اور شیر خور ملے، مٹلی لباس
 پہنے۔ جھوٹے موتیوں کے زیور سے سجی سجائی صندل ہی سامنے آئی۔ یہ تو ایسے ہوش
 بھول بیٹھے کہ پوچھتے نہیں۔ ماں کو ٹھیل ٹھیل کر پیام بھجوا کر ہی دم لیا۔ مگر ماما جانی
 نے ایک مونہہ لاکھ بول سنا کر چھوڑے۔ بابا حضور ہنس ہنس کر کہتے رہتے۔
 ”اجی بیگم صاحبہ غریبی کوئی عیب تو ہے نیش جو آپ ایک اچھے خاصے توتے
 رشتے کو توڑ دے رہیں۔“ لیکن ایسے موقعوں تو بابا حضور کی بھی ایک چلتی۔
 ان سب سے بڑھ کر بابا حضور کے خاص منشی جی کے بیٹے مراد کا تو یہ حال
 تھا کہ آتے جاتے صندل کے داری پھیرے جاتا۔ اس نے تو جیسے ہتھ ہی کر رکھا
 تھا کہ شادی کروں تو صندل سے، نیش تو جان ہی دے دوں گا۔ ”صندل اس
 کی محبت کو ہنس بول کر برداشت کرتی رہتی تھی۔ لیکن ادھر جب سے یوسف
 پاشا سے کلی سے پھول بنا گئے تھے وہ انھیں کے گلے کا ہار بن کر جینے پر تل گئی تھی۔
 اتنے بے شمار دنوں میں بس ایک بار دی دنوں کا آنا سامنا ہوا۔ صندل عصر کی
 نماز پڑھ کر چلے نماز تہہ کر کے رکھ رہی تھی۔ ابھی سفید دوپٹہ معصوم چہرے کے
 گرد بندھا ہی ہوا تھا، جیسے سارے سماؤں کا انداز اسی ایک چہرے پر اُتر
 آیا تھا۔ اسی دم باہر سے مارچیلوں پر چغیں سنائی دینے لگیں۔ یوسف

میاں ہر نوکر اور نوکرانی کا نام لے کر پکار رہے تھے۔ بھاگتے دوڑتے بہت سارے لوگ ان کے کمرے میں پہنچے تو پتہ چلا کہ ان کی جھک جھکاتی نئی سلکرن قمیص پر سیاہی اوندھ گئی ہے۔ اور وہ ایک ایک سے داغ دوڑ کرنے کی ترکیب پوچھ رہے ہیں۔ مراد نے ان کو چوناٹنے کو کہا اور خود سنہری روکتا باہر نکل گیا اس کے پیچھے باقی لوگ بھی چل بیٹے۔ بس وہ کھڑی رہ گئی۔ جی چاہا پوچھے۔ "ایک نامراد قمیص پر ذرا سا سیاہی کا چھینٹا پڑ گیا تو اس کے داغ دھو رہے ہو نواب۔ لیکن جو میری چاندنی جیسی زندگی کو داغ داغ کر دیا ہے تو اسے کون سے چوڑے سے دھوؤ گے؟" لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔ یوں ہی بیجاگی کی تصویر بنی کھڑی رہی۔ اچانک یوسف میاں نے پلٹ کر دیکھا۔ اللہ اللہ کس قدر انجان نگاہیں بھتیں! کہاں تو صندل سوچ رہی تھی کہ اسے دیکھتے ہی یوسف پاشا کو کچھ نہ کچھ تو یاد آئے گا۔ انگاروں کی طرح دہکے ہوئے ہر ننٹوں کا کوئی، کھولا بوسرا بوسہ، گیلے بدن کی کوئی نو۔ اور کچھ نہیں تو حیدر آبادی نگوں والے گوٹ کا ٹھٹھا ٹکڑا ہی۔ لیکن انھوں نے کہا تو صرف اتنا کہا: "ارے تو اتنی دہکی کاٹے سے ہو گئی۔"

اس طرح بس دو ہی سبق میں پیار کا پورا ڈرامہ ہی ختم ہو گیا۔ اور اب تو حویلی میں وہ دھومک دھیا تھی کہ کان بڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ پہلے تو خود حویلی ہی اتنی بڑی کہ زور لگا کر چیخو تو ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک آواز نہ جاٹے۔ اور اب تو شادی کی چیخ دیکار بج رہی تھی، تنگ آکر تما جانی نے دالان میں نوکروں کو بلانے کے لئے ایک گھنٹہ ٹنگا دیا۔

ایسے شور شرابے میں صندل کی سسکیاں کون سنتا؟

جتنا بڑا گھرانہ تھا، اتنا ہی بڑا سمدھیانہ بھی ملا۔ زلیخا بیگم کے دوہا
 میاں کو ایک نہ دو پورے پانچ لاکھ کل دار پئے جوڑے گھوڑے کے منڈے پائے
 بیٹی کا جہیز الگ رہا۔ داماد بیٹی کے لئے ایک خوبصورت سچی سجائی کوٹھی الگ، ہر
 زمرہ، یا قوت کے کائنات، گئے اور ہاتھوں کے سیٹ الگ، سونے کا پاندان، سونے
 کا اگال دان، سونے کا چھپر کھٹ، سوا سو جوڑے۔ ہر جوڑا گولے پٹے سے پس
 مہندی کے روز ہی جہیز اور لین دین کی پوری فہرست سلامت یا ر جنگ نے
 بھجوا دی تھی۔ تاکہ اہل دعیال کے سامنے، غلام کر دیا جاوے۔ شادی کے دعوتی
 رقعے چھپوانے میں ایک حدت یہ برتی گئی کہ سونے کے پیروں پر حرف کھدائے
 گئے تھے۔

جس دن شادی کی بارات چڑھی، حیدر آباد کی سڑکوں کا یہ عالم تھا
 کہ کھوٹے سے کھوٹا چمکتا تھا۔ بیٹی دالوں کی شان ایک طرف، دو لہا والے جب
 نکلے تو چڑھاوے کا وہ عالم تھا کہ یہاں سے وہاں تک سوا چاندی کے تھالوں
 طشتوں کے کچھ نظری نہ آتا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں خانگی امین (بادردی،
 سپاہی) ان تھالوں کی حفاظت کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ لاکھوں پٹے
 کے سامان اور زیورے بھرے ہوئے تھے۔

بارات چار مینار کی چوڑی چکی سڑک سے ہوتی ہوئی حب معظم جا رہی
 رد تک پہنچی تو نکاح کا وقت جو رقعوں میں پانچ بجے شام کھدوایا گیا تھا
 ٹل کر سات کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اور ابھی بھی اونچی اونچی شکر میں
 بگھیاں، ٹلنگے، ہاتھ رکشا میں اور موٹریں خراماں خراماں دہن کی ڈیوڑھی
 تک پہنچ رہی جا رہی تھیں۔

نکاح میں آدھ پون گھنٹے کی دیر ہوئی کہ تما جانی نے اس ستہری صندوقی کا جائزہ لیا، جس میں دولہن کو نکاح سے پہلے چڑھایا جانے والا زیور بند تھا بھول کر دیکھا تو یاد آیا کہ سب سے قیمتی کوئی سوالا کھ کا جو ہیروں کا سیٹ تھا وہ حویلی میں ایک الماری میں ہی بھول آئی ہیں۔ دو چار آدمیوں کو دوڑا کر انھوں نے اعتماد دلانے کو اندر زنان خانے کے دروازے تک بلایا اور گھبرا کر کہا ”اُجاڑا دیو پوٹی پڑو۔ وہ اصلی زیور تو میں حویلی میں اچ بھول آئی آپ جلدی جا کر لایو نہیں تو بڑی بھد اڑیں گی۔“

نواب صاحب نے کچھ ناک کان چڑھانے چاہے تو وہ ہولا کر بولیں ”ایو آپ خود چ جا کر لاؤ جی۔ اتنا بھاری زیور۔ میں کسی کا بھروسہ نہیں کر سکتی۔“ ناچار نواب صاحب خود ہی موٹر پر بیٹھنے، ڈرائیور نے تیزی سے گاڑی چلائی۔ سچی سچائی مگر اس وقت خالی ڈھنڈار حویلی میں گھستے چلے گئے۔ جس کمرے میں دولہن کو لا کر اتارنا تھا۔ وہ تما جانی کے کمرے سے ہی ملا ہوا تھا الماری کھول کر انھوں نے ہیروں کا سیٹ نکالا۔ اُنٹے ہیروں واپس ہونے ہی کو تھے کہ ہچکیاں اور سسکیاں سنائی دیں۔ ”ساری حویلی تو اُٹھ کو سمجھیلنے لگی ہے۔ اب یہاں کون روتے بیٹھا ہے۔ انہوں نے منہ ہی منہ میں کہا اور کمرے میں جھانکا۔

زرتار پھولوں سے لدی مسہری کے ایک کونے پر سر ٹکائے صندوق بے تابانہ رو رہی تھی۔

”صندوق۔ تو۔“ نواب صاحب حیرت سے بولے: ”کیا ہوا تجھے“

شادی میں کیوں نہیں گئی تو؟“

صندل نے آج تک کبھی نواب صاحب کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت تک نہیں کی تھی۔ لیکن آج محبت کی مار نے اسے ہر خوف اور ہر ڈر بھرے جذبے سے آزاد کر دیا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور بلبکتی ہوئی نواب صاحب کے سینے سے جا لگی،

”بابا حضور۔۔۔۔۔“

نواب صاحب کا دل دھڑک اٹھا۔

”کیا ہوا صندل — تو اتنا رویوں رٹی ہے۔؟“ وہ گھبرا گئے۔

صندل جگر بھاڑ کر بولی: ”آج میرے پیٹ میں بچہ ہوتا تو میری عقل میں بدنام کر دیتی کہ دیکھو لوگوں یہی وہ آدمی ہے جس نے مجھ کو زاری کو یہ پھل دیا۔ اور آپ دو لہا بن کو بھیٹا ہے۔ پر میں تو وہ بد نصیب ہوں بابا حضور جو لٹ کر بھی نہ لٹی۔۔۔۔۔“

نواب صاحب نے رُک رُک کر صدمے کے ساتھ پوچھا ”کیا یوسف پاشا تم کو کچھ بولے؟“

”بولے؟“ وہ روتے روتے عقدہ اور طنز کے ساتھ بولی: ”اس ایک لول نے تو میری زندگی اجاڑ کر دی کہ میں تم سے شادی کر لیوں گا۔“ وہ پھر رونے لگی بابا حضور میں اسی ایک بول پر اپنے کو مٹا بیٹھی، لٹا بیٹھی، نیٹیں تو بابا حضور میں عورت نہیں تھی چٹان تھی۔۔۔۔۔ ایک اچ وعدہ نے میرے کو تباہ کر دیا۔۔۔۔۔“

”یوسف پاشا تجھ سے وعدہ کئے تھے کہ شادی کر لیوں گا؟ نواب صاحب انگلی اٹھا کر بولے ”سچ بولتی تو؟“

”جی ہو بابا حضور۔ سچی میں جھوٹ نہیں بولتی۔“ وہ سسکتے ہوئے کہنے لگی۔ ”اسی واسطے میں جھک بھی گئی تھی بابا حضور۔ نیٹس تو میں اتنی کچی نیٹس تھی۔ دلہن بننے کی چاہت میں تو اُجڑ گئی۔ بابا حضور....“

نواب صاحب نے لپک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ایسے بدگوئی کی باتاں مت کر صندل بیٹی۔“ وہ اس کا سر اٹھا کر بولے۔ ”بیگم صاحبہ تیرے کو پوسٹ پاشا کی شادی کے واسطے کوئی بھاری جوڑا نہیں سلائے۔“

سلائے تو۔۔۔ مگر میرا دل پہننے کو نیٹس چاہا۔“

”اچھا جا۔ جلدی سے وہ جوڑا تو پہن لے۔“

ایک ہاتھ میں ہیروں کا سیٹ، اور دوسرے ہاتھ میں صندل کا ہاتھ تھا نواب اعتماد الدولہ گاڑی سے اترے۔ زنان خانے میں جا کر بیوی کو بلایا، حکم دیا۔ ”چڑھاوے کا سارا زیور، ہیروں کے سٹ سمیت صندل کو پہنا دیو۔“

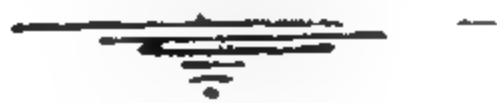
یہاں سے وہاں تک ساری حویلی میں کھلبلی مچ گئی۔ بیگم صاحبہ ہاں، ہاں کرنے لگیں تو چلا کر بولے۔ ”جو ہم کہتے ہیں وہ کرو۔ آپ کو معلوم ہم جو بہتر سمجھتے ہیں وہ کرتے ہیں۔ وہ غصہ میں سدا خود کو ہم“ بولنے لگے بھتے۔

بھری محفل اور سبھی مسند سے یوسف میاں کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا۔ زنان خانے میں لائے، صندل کے چہرے سے زرتار گھونگھٹ اٹھا کر بولے۔ ”اس رٹ کی کو بہچا پانتے ہو میاں؟“

یوسف میاں کچھ نہ بولے۔ نواب صاحب نے کہا۔ گود گرم کرتے

چلے جلتے۔ ہم کو اعتراض نہ ہوتا، مگر میاں تم شادی کا وعدہ کرے اور توڑ
 دیئے۔ یہ مردوں کی زبان جو ہے۔۔۔ انھوں نے اپنی زبان نکال
 کر انھیں دکھائی۔ ”ایک بار جو کہہ دے پورا بھی کرتی ہے۔“ وہ نرم ہلچے
 میں گرہے۔ ”میں آپ کی زبان سے سنا چاہتا ہوں یوسف میاں کہ آپ
 صندل بیگم سے خوشی خوشی شادی کریں گے۔ ادا سے خوش بھی رکھیں گے۔“
 یوسف میاں نے سراٹھا کر انھیں دیکھا تو وہ اسی ہلچے میں کہے گئے۔
 زینبا بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ اس کو تم نیش بھی بیلا ہے تو اس کو تم سے اچھے
 دس برل جائیں گے۔ مگر اس دل کو توڑ کر تم سکھ سے رہ سکیں گے میاں؟“
 یوسف میاں نے ذرا ڈرتے سمیتے پاس کھڑی ہوئی صندل کی طرف
 اک نگاہ کی ہی تھی کہ نواب صاحب کے چہرے پر گلاں سا بکھر گیا۔ مسکراتے
 ہوئے انھوں نے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا مردانہ کی طرف جلتے ہوئے
 بولے۔

”میں دلہن کا باپ ہوں۔۔۔ سو لاکھ سے کم مہر پر شادی نہیں ہونے
 دیوں گا۔ سمجھے دولہا میاں؟“



ذرا ہوا پر

نواب صاحب نوکر خانے سے جھومتے جھومتے نکلے تو اصلی چنبیلی کے تیل کی خوشبو سے ان کا سارا بدن مہکا جا رہا تھا۔
 اپنے شان دار کمرے کی بے پناہ شان دار مسہری پر آکر وہ دھپتے گرے
 تو سارا کمرہ مدھم مدھم ہو گیا۔ پاشا دلہن نے ناک اٹھا کر رضا میں کچھ سونگھتے ہی خطرہ
 محسوس کیا۔ اگلے ہی لمحے وہ نواب صاحب کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ سراپا انگارہ
 بنی ہوئی۔

”سچی سچی بول دیو آپ کاں سے آرئیں۔ جھوٹ بولنے کی کوشش نہ
 کرو۔“

نواب صاحب ایک شان دار سنہری چنسنے۔
 ”مہنا جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ جوتے سمجھے وہ بیچ پیچ ہے۔“
 ”گل بدن کے پاس سے آرئیں نا آپ؟“

”معلوم ہے تو پھر پوچھنا کاٹے کو؟“

جیسے آگ کو کسی نے بارود دکھا دی ہو۔ پاشا دہن نے دھنا دھن پہلے تو تکیہ کوٹ ڈالا۔ پھر ایک ایک چیز اٹھا اٹھا کر کمرے میں پھینکنی شروع کر دی ساتھ ہی ساتھ ان کی زبان بھی چلتی جا رہی تھی۔

”اُجاڑ اُٹے آیا جان اور امی جان کیسے مردوٹے کے حوالے میرے کو دیئے غیرت شرم تو چھو کو بھی نیٹیں گئی! دنیا کے مردوٹے ادھر ادھر تاک جھانک کرتے نہیں کیا، پن آنے تو میرے سامنے کے سامنے ادھم بچالے رہیں۔ ہو را جاگری تو دیکھو کتے مزے سے بولتیں، معلوم ہے تو پھر پوچھنا کاٹے کو! میں بولتیوں جاڑ یہ آگ ہے کیسی کی بھتی آج نہیں۔ کتے عورتاں اُٹے ایک مردوٹے کو ہوتا جی۔۔۔۔۔ اب وہ ساتھ ساتھ پھپھک پھپھک کر رونے بھی لگی تھیں۔“ اُجاڑ میرے کمرے زندگی نکو۔ اپنا راج محل تچ سنبھالو۔ میرے کو آج طلّاح دے دیو۔۔۔۔۔ میں ایسی کال کو نڈی میں نیٹیں رہنے والی۔۔۔۔۔“

مگر جیسا سازدہ کی پیاس میں پانی چھوڑ شراب پی کر آیا ہو۔ وہ بھلا، کہیں اتنی دیر تک جاگتا ہے؟ اور عورت کی گرمی ملے تو یوں بھی اچھا بھلا مرد پٹ کر کے سو جاتا ہے۔۔۔۔۔ نواب صاحب بھی اس وقت اس تمام ہنگامے سے بے خبر گہری نیند سوچے چکے تھے۔

کیسی زندگی پاشا دہن گزار رہی تھیں! بیاہ کر آئیں تو بیس سے ادھر ہی تھیں۔ اچھے بُرے کی اتنی بھی تمیز نہ تھی کہ میاں کے پیر کھیں تو رات بے رات خود ہی دبا دیں۔ جوانی کی نیند یوں بھی کیسی ہوتی ہے۔ کوئی گھر کوٹ کر لے جاٹے اور آنکھ تک نہ پھڑکے۔ جب بھی راتوں میں نواب صاحب

نے درد کی شکایت کی، انھوں نے ایک کروٹ لے کر اپنے ساتھ آئی باندیوں میں سے ایک آدمی کو میاں کی پامٹی بٹھا دیا اور اسے ہدایت کر دی "لے ذرا سرکار کے پاؤں دبا دے۔ میرے کو تو نیند آئی۔"

صبح کو یہ خود بھی خوش باش اٹھتیں۔ اور نواب صاحب بھی۔ کبھی کبھار نواب صاحب لگاڑٹ سے شکایت بھی کرتے۔ "بیگم آپ کبھی تو ہمارے پاؤں دبا دیو، آپ کے ہاتھوں میں جولڈت ملے گی وہ اسے حرام زادیاں کاں لائیں گے۔"

مگر یہ بلبلا جاتیں۔ "ہو یہ ایک نوی بات سنو، میں بھلا پاؤں دبانے کے بیچ ہوں کیا۔ اس واسطے تو امی جان باندیاں کی ایک فوج میرے ساتھ کر کوٹے کہ بیٹی کو تکلیف نہیں ہونا بول کے۔"

اور نواب صاحب دل میں بولتے۔ خدا کرے تے ہو رگہری نیند سو۔ تمہارے سوتے اپج ہمارے واسطے توجہت کے دروازے کھل جاتیں۔ مگر دھیرے دھیرے پاشا دلہن پر یہ بھیدیوں کھلا کہ نواب صاحب نئی نوپلی دلہن سے یک سرے گانہ ہوتے چلے گئے۔ اب بیاہی بھری تھیں اتنا تو معلوم ہی تھا کہ جس طرح پیٹ کی ایک بھوک ہوتی ہے اور بھوک لگنے پر کھانا کھایا جاتا ہے۔ اسی طرح جسم کی ایک بھوک ہوتی ہے اور اس بھوک کو بھی بہر طور مٹایا ہی جاتا ہے۔ پھر نواب صاحب ایسے کیسے مرد تھے کہ برابر میں خوشبوؤں میں بسی دلہن ہوتی اور وہ ہاتھ تک نہ لگاتے اداب تو یہ بھی ہونے لگا تھا کہ رات بے رات کبھی ان کی آنکھ کھلتی تو دیکھتیں کہ نواب صاحب مسہری سے غائب ہیں۔

اب غائب ہیں تو کہاں ڈھونڈیں۔ عویلی بھی تو کوئی ایسی ویسی عویلی تھی۔ حیدر آباد دکن کے مشہور نواب ریاست یار جنگ کی عویلی تھی کہ پوری عویلی کا ایک ہی چکر لگانے بیٹھو تو موٹی ٹانگیں ٹوٹ کے چور ہو جائیں۔ پھر رفتہ رفتہ آنکھیں کھلنی شروع ہوئیں۔ کچھ ساتھ کی بیاہی سہیلیوں کے تجربوں سے پتہ چلا کہ مرد پندرہ پندرہ میں بیس دن ہاتھ تک نہ لگاٹے راتوں کو مسہری سے غائب ہو جاٹے تو دراصل معاملہ کیا ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایسی بات تھی کہ کسی سے کچھ بولتے بنتی نہ بتاتے۔ مشہورہ بھی کرتیں تو کس سے؟ اور کرتیں بھی تو کیا کہہ کر، کیا یہ کہہ کر میرا میاں عورتوں کے پھیر میں پڑ گیا ہے نہ اسے بچاؤں کیسے۔ اور صاف سیدھی بات تو یہ تھی کہ مرد وہی بھٹکتے ہیں جن کی بیویوں میں انھیں اپنے گھٹنے سے باندھ کر رکھنے کا سلیقہ نہیں ہوتا۔ وہ بھی تو آخر مرد ہی ہوتے ہیں جو اپنی ادھیڑا دھیڑ عمر کی بیویوں سے گوند کی طرح چپکے رہتے ہیں۔ غرض ہر طرف سے اپنی ماری اپنی ماری تھی۔ لیکن کر بھی کیا سکتی تھیں خود میاں سے بولنے کی تو کبھی ہمت ہی نہ پڑی۔ مرد جب تک چوری چھپے منہ کالا کرتا ہے۔ ڈرا مہما ہی رہتا ہے۔ اور جہاں بات کھل گئی وہیں اس کا منہ بھی کھل گیا۔ پھر تو ڈنکے کی جھڑکچھ کرتے نہیں ڈرتا۔ لیکن ضبط کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ایک دن آدمی رات کو یہ تاک میں بیٹھ بیٹھ بیٹھ بیٹھ بیٹھ بیٹھ۔ آخر شادی کے اتنے سال گزار چکی تھیں۔ دو تین بچوں کی ماں بھی بن چکی تھیں۔ اتنا حق تو دیکھتی ہی تھیں۔ اندر عقل بھی کہ آدمی رات کو جب سو رہا ہے تو اسے آٹے اور یوں آٹے کہ چہرے پر یہاں دہاں کالک ہو تو وہ سو اپرائی عورت کے کاجل کے اور کاہے کی کالک ہو سکتی ہے۔ کیونکہ بہر حال دنیا میں اب تک یہ تو نہیں ہوا ہے کہ کسی کے گناہوں سے مومنہ کالا ہو جاٹے۔

جیسے ہی نواب صاحب کمرے میں داخل ہوئے کہ چیل کی طرح جھپٹیں اور

ان کے چہرے کے سامنے انگلیاں پٹا کر بولیں "یہ کالک کال سے مقرب کو لائے؟
 اور نواب صاحب بھی آخر نواب ہی تھے، کسی حرام کا تخم تو تھے نہیں، اپنے ہی باپ کی
 عقد خوانی کے بعد عالی حلال کی اولاد تھے۔ ڈرتا ان کا جوتا۔ بڑے رسان سے بولے
 "یہ مہر و کسبت بہت کا جل بھرتی اپنے آنکھاں میں۔ لگ گیا ہو ٹیٹا گا، اسی کا"
 ایسے تیہ سے تو پاشا دلہن اٹھی تھیں مگر یہ سن کر وہ ہیں ڈھیر ہو گئیں۔ اگر
 مرد ذرا بھی آنا کاتی کرے تو عورت کو گایاں پینے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن یہاں تو
 صاف سیدھی طرح انھوں نے گویا اعلان کر دیا کہ ہاں، ہاں، میں نے بھاڑ بھونکا۔
 اب بولو!

پاشا دلہن کچھ بول ہی نہ سکیں، بولنے کو تھا بھی کیا، جو چکی ہو بیٹ تو بس
 چپ ہی لگ گئی۔ اب محل کے سارے ہنگامے، ساری چہل پہل، ساری ٹھوم
 و صام ان کے لئے بے معنی تھی۔ درندہ ہی پاشا دلہن تھیں کہ ہر کام میں نفسی پڑتی تھیں
 پہلے تو دل میں آیا کہ جتنی بھی یہ جوان جوان حرام خدیباں ہیں انھیں سب کو ایک سرے
 سے برطرف کر دیں، لیکن رعایت سساتنی بڑی بغاوت کر بھی کیسے سکتی تھیں۔ پھر اپنے
 مقابل کی حیثیت دایوں میں یہ مشہور ہو جاتا کہ اللہ مارے کیسے لوباں ہیں، کام
 کاج کو چھو کر یاں، تک نہیں رکھے! بس ہر طرف سے ہار ہی ہار تھی۔ دل پر دکھ کی مار
 پڑی تو جیسے ڈھیر ہو گئیں۔ نئی نئی بیماریاں بھی سراٹھانے لگیں۔۔۔ کمر میں درد
 سر میں درد، پیروں میں درد، ایک منیٹھن، تھی کہ جان لئے ڈانتی۔ حکیم صاحب
 بلائے گئے۔ اس زمانے کے حیدر آباد میں مجال تھی کہ حکیم صاحب محل دایوں کی
 جھپک تک دیکھ سکیں۔ بس پڑے کے پیچھے سے ہاتھ دکھا دیا جاتا۔ پھر ساتھ ہی ایک
 ملی ہوتی جو حکیم امان کہلاتی تھیں۔ وہ سارے معاملے کرتیں اور لوگوں کو بخونے

ہوتی۔ بس حکیم صاحب بنفص دیکھنے کے گناہ گار ہوتے۔
 پاشادہن کی کیفیت سن کر حکیم صاحب کچھ دیر کے لئے خاموش رہ گئے
 انھوں نے بظاہر غیر متعلق سی باتیں پوچھیں جس کا دراصل اس بیماری سے براگہرا
 تعلق تھا۔

”نواب صاحب کہاں سوتے ہیں؟“

حکیم امّاں نے پاشادہن سے پوچھ کر بات آگے بڑھائی۔ ”جی انوں تو
 مردانے میں اچ سوتے ہیں۔“

اب حکیم صاحب بالکل خاموش رہ گئے۔ سوئے ادب! کچھ کہتے تو مشکل
 نہ کہتے تو مشکل۔ بہر حال ایک تیل ماش کے لئے دے گئے۔

پاشادہن کو ان کسخت باندیوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ بس نہ چلتا کہ سنا
 آتیں اور یہ کچا چبا جاتیں۔ باندیوں میں سے کسی کو انھوں نے اپنے کام کے لئے
 نہ چنا۔ حویلی کا ہی پالا ہوا ایک چھوٹا سا چھوکر اتھا انھوں نے طے کر لیا کہ ماش اسی
 سے کرائیں گی، چودہ پندرہ برس کے چھوکرے سے کیا شرم؟

اسی بیچ میں دو تین بار نواب صاحب اور دہن پاشا کی خوب زوردار لڑائی
 ہوئی، شکریہ کہ جو نوبت طلاق تک نہ پہنچی۔ اب تو نواب صاحب کھلم کھلا
 کہتے تھے۔ ”ہاں میں آج اس کے ساتھ رات گزارا۔ اس کے ساتھ مستی کیا
 ۔ تم نا کچھ بولنا ہے۔؟“

پاشادہن بھی جی کھول کر کوسیتیں کاٹتیں، ایک دن بے الفاظ میں جب
 انھوں نے اپنی بھوک ”کا ذکر کیا تو نواب صاحب دراجیرت سے بھینس دیکھ کر لڑے
 ”دیکھو اندھیاں کو معلوم تھا کہ مرد کو کچھ زیادہ ہونا پڑتا اس واسطے اچ اندھیاں کٹ

چار، چار شادیوں کی اجازت دیا۔ ایسا ہوتا تو عورتاں کو کیوں نہیں دے دیتا تھا؟ یہ ایک ایسا نکتہ نواب صاحب نے پکڑا کہ پاشا دہن تو بالکل ہی لاجواب ہو کر رہ گئیں اور یوں رہی یہی جو بھی پردہ داری تھی بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ اس صبح ہی کی بات تھی کہ انھوں نے سر میں تیل ڈالنے کو چنبیلی کے تیل کی کیشیش اٹھائی اور وہ کمبخت ہاتھ سے ایسی چھوٹی کہ ندی سی بہہ اٹھی۔ گھبرا کر انھوں نے پاس کھڑی گل بدن کو پکارا۔

”بیکار بہہ کو جارا تو چ اپنے سر میں چڑے۔“

اور رات کو وہ ساری خوشبو نواب صاحب کے بدن میں منتقل ہو گئی جس کے بارے میں اعلان کرتے ہوئے انھیں ذرا سی جھجک یا شرم محسوس نہیں ہوئی۔

پتہ نہیں یہ کون لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ عورت بیسی اور گھیس۔ عورت تو تئیں کی ہو کر کچھ اور ہی چیز ہو جاتی ہے۔ ان دنوں کوئی پاشا دہن کا روپ دیکھتا۔

چڑھتے چاند کی سی جوانی۔ پور پور چٹنا پڑتا۔ برسات کی راتوں میں ان کے جسم میں وہ تندرپا ہونا جو کسی استاد کے کسے ہوئے ستار میں کیا ہوگا۔ اتنا سا چھو کر کیا اور اس کی بساط کیا۔ سر اور کمر سے نیٹ کر وہ پیروں کے پاس آ کر بیٹھتا تو اس کے ہاتھ دکھ دکھ جاتے، پنڈلیوں کو جتنی زور سے دباتا، وہ یہی کہے جاتیں۔

”کتنے اہلو ہلو دباتا ہے تو۔۔۔ ذرا تو طاقت لگا۔“

چودہ پندرہ سال کا چھو کر، ڈر ڈر کے سہم سہم کر دباٹے جاتا کہ کہیں زور سے دبا دینے پر پاشا ڈانٹ نہ دیں۔ اتنی بڑی حویلی کی مالک جو بھیتیں۔

حویلی میں ان دنوں خواتین میں کلی دار کرتوں پر چوڑی دار پاجامے پہننے کا رواج تھا۔ لڑکیاں بالیاں غرارے بھی پہن لیتیں۔ اور بڑے نہنگاموں کے بعد بساطی کا بھی نزول ہوا تھا۔ مگر بہت ہی کم پہنانے پر۔

چوڑی دار پاجامے میں پنڈلیاں صرف دباٹی جاگتی تھیں۔ تیل ماش کیا خاک ہوتی
پاشا دلہن نے ماما کو بلوا کر اپنے پاس کھڑا کیا۔ یہ حویلی کے کسی بھی نوکر کے لئے بڑے اعزاز
کی بات تھی۔ پھر پاشا بولیں:۔

”دیکھو یہ اپنے چھوکر رحمت ہے نا؟ اس کو کھانے پینے کو اچھا اچھا دیو۔
ناشتے میں اصلی گھی کے پراٹھے بھی دیو۔ اس نے میرے پیروں کی مالش کرتا۔ مگر ذرا
بھی اس میں طاخت نیٹیں۔ اب میں جتا کر دی۔“

پھر خود اٹھوں نے غرارہ پہننا شروع کر دیا۔ تاکہ پنڈلیوں کی اچھی طرح مالش
ہو سکے اور انھیں درمے سے نجات ملے۔

اب جب دوپہر کو مالش شروع ہوتی تو امک ہی مکالمے کی گردان رحمت
کے کانوں سے ٹکراتی۔

”ذرا ہوراد پڑ!“

وہ سہم سہم کر مالش کرتا۔ ڈر ڈر کر پاشا کا منہ تکتا۔ تیل میں انگلیاں چیر کر وہ
غرارہ ڈرتے ڈرتے ذرا اوپر کھسکا تا کہ کہیں مشجر، اطلس، یا کمخواب کے غرارے
کو تیل کے دھبے بد نما نہ بنادیں۔ جم چاتی پنڈلیاں تیل کی مالش سے آئینہ بنتی جا رہی
تھیں۔ رحمت غور سے دیکھتے دیکھتے گہرا گہرا اٹھتا کہ کہیں ان میں اس کا چہرہ نہ دکھائی
دے جائے۔

ایک رات دلہن پاشا کے پیروں میں کچھ زیادہ ہی درد اور اینٹھن تھی۔
رحمت مالش کرنے بیٹھا تو سہمتے سہمتے اس نے پنڈلیوں تک غرارہ کھسکایا۔

”ذرا ہوراد پڑ“ دلہن پاشا کسمسا کر بولیں۔ آج اُجاڑا تا درد ہو رہا کہ میرے
کو بخار جیسا لگ رہا۔ گھٹنوں تک مالش کر ذرا۔ تو تو خالی بس پنڈلیاں اچ دباریا۔“

رحمت نے بخار کی سی کیفیت اپنے اندر محسوس کی، اس نے لرزتے ہاتھوں سے غرارہ اور اُوپر "کھسکایا اور ایک دم ناریل کی طرح چکنے چکنے اور سفید مدور گھٹنے دیکھ کر بوکھلا سا گیا۔ ترتراتے گھی کے پراٹھوں، دن رات کے بیوڑوں اور رغن کھانوں نے اسے وقت سے ذرا پہلے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا، جہاں بیند کے بجائے جاگتے میں ایسے ویسے خواب دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس نے ہڑبڑا غرارہ ٹخنوں تک کھینچ دیا۔ تو اونگھتی ہوئی پاشادہن بھٹا گئیں۔

"ہورے، میں کیا بول رہی، ہور تو کیا کر رہا؟" انھوں نے ذرا سا سراکھا کر غصے سے کہا۔ وہاں ان کے سر ہانے سنسناتا ہوا، جو ان ہوتا ہوا۔ وہ چھو کر بیٹھا تھا جسے انھوں نے اس لئے چنا تھا کہ انھیں پھو کر یوں سے از حد نفرت ہو گئی تھی کہ کم غبتیں ان کے میاں کو بھیا بھتیا لیتی تھیں۔

انھوں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس نے بھی ڈرتے ڈرتے سہی، مگر ذرا غور سے انھیں دیکھا اور اک دم سر جھکا لیا۔

ٹھیک اسی وقت نواب صاحب کمرے میں داخل ہو گئے۔ جلنے کو نسا نشہ چڑھا کر آئے تھے کہ جھولے ہی جا رہے تھے۔ "آنکھیں چڑھی پڑھی ہیں۔ مگر اتنے نشے میں بھی بیگم کے قدموں میں بیٹھا دیکھ کر چونک اُٹھے۔

"یہ اے حوام زادہ مسٹنڈا یہاں کیا کرتے کو آیا بول کے؟" رحمت تو نواب صاحب کو دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگ گیا۔ مگر پاشادہن بڑی رعونت سے بولیں "آپ کو میرے بیچ میں بولنے کا کیا حجت ہے۔؟"

"حج؟" وہ گھور کر بولے "تمہارا دھکڑا ہوں، کوئی پالکڑا نہیں سمجھے! یہی حج کی بات، سو یہ حج اللہ اور اس کا رسول دیا۔ کون تھا وہ مردود؟"

آپ اتنے سالوں ہو گئے، آپ ایک ایک چھو کری سے پاواں دبا لے رہیں، ہور
اللہ معلوم ہور کیا کیا تماشے کر لے رہیں، وہ سوب کچھ نہیں، ہور میں کبھی دکھ میں
بیماری میں مالش کرانے ایک آدمہ چھو کرے کو بھٹالی تو اتنے حساباں کاٹے کو؟

”اس واسطے کی مرد بولے تو دالان میں بچھا خالین ہوتا کہ کتنے بھی پاواں
اس پہ پڑے تو کچھ فرخ نہیں پڑتا۔ ہور عورت بولے تو عزت کی سفید چدر ہوتی
کہ ذرا بھی دھبہ پڑا تو سب کی نظر پڑ جاتی۔“

دلہن پاشا بلبل کر بولیں ”اٹی اماں، بڑی تمہاری عزت جی۔ ہور تمہاری بڑی
شان! اپنے دامن میں اتنے داغاں رکھ کو دوسرے کو کیا نام رکھتے جی تھے! ہور کچھ
نہیں کچھ نہیں تو اتے سے پوٹے کے اپرا تا وادیا کر لیتے بیٹھیں۔“

اک دم نواب صاحب چلائے، تمنا وہ پوٹا اتا اتا سا دکھتا؟ ارے آج
اس کی شادی کرو نو مہینے میں باپ بن کر دکھا دیں گا۔ میں جتا، یا آج سے اس کا
پاؤں نہیں دکھنا تمہارے کمرے میں۔

پاشا دلہن تن کر بولیں ”ہور دکھا تو؟“

”دکھ تو طلاخ“ وہ آخری فیصلہ سناتے ہوئے بولے۔

”ابھی کھڑے کھڑے دے دیو۔“ پاشا دلہن اسی تہیہ سے بولیں۔

ایک دم نواب صاحب سٹ پٹا کر رہ گئے۔ بارہ تیرہ سال میں، کتنی بار
تو تو میں میں ہوئی۔ کتنے رگڑے جھگڑے ہوئے۔ باعزت، باوقار، دو
خاندانوں کے معزز میاں بیوی، جو پہلے ایک دوسرے کو آپ، آپ، کہتے نہ تھکتے
تھے، اب تم تمہارے آگئے تھے۔ مگر یہ نوبت تو کبھی نہ آئی تھی، خود پاشا دلہن نے
ہی کئی بار یہ پیش کش کی کہ ایسی زندگی سے تو اجاڑ میرے کو طلاخ دے دیو۔ لیکن

یہ بھی نہ ہوا تھا کہ خود نواب صاحب نے یہ فال بد منہ سے نکالی ہو۔ اور اب منہ سے نکالی بھی تو یہ کہاں سوچا تھا کہ وہ کہیں گی کہ ہاں ابھی کھڑے کھڑے دے دیو!!

مگر پاشا دہن کی بات پوری نہیں ہوئی تھی۔ ایک ایک لفظ یہ زور دیتے ہوئے وہ تمنا تے چہرے کے ساتھ بولیں۔ ”ہو رطلانخ لئے بعد سارے حیدرآباد کو سناتی پھردں گی کہ تے عورت کے لائق مرد نیٹیں تھے۔ یے بچے تمہارے نیٹیں۔ اب پھوڑو میرے کو! ہو ر دیو میرے کو طلانخ!“

یہ عورت چاہتی کیا ہے آخر۔؟ نواب صاحب نے سر کپکپایا۔ اٹھو! نے ذرا شک بھری نظروں سے بی بی کو دیکھا۔ کہیں دماغی حالت مشتبہ تو نہیں وہ سنا رہی تھیں۔

”اس حویلی میں دکھ اٹھائی نائیں۔ تمہارے ہوتے اب سکھ بھی اٹھاؤں گی۔ تمہارے رچ ہوتے سن ہو۔“

دوسری رات پاشا دہن نے سرسراقی ریشمی ساڑی اور لہنگا پہنا۔ خود بھی تو ریشم کی بنی ہوئی تھیں۔ اپنے آپ میں پھسلی پڑ رہی تھیں، پھر جب رحمت مالش کرنے بیٹھا تو بس بیٹھا ہی رہ گیا۔

”دیکھتا کیا ہے؟ ہاتھوں میں دم سنیں کیا؟“

اس نے سرسرا آتا لہنگا ڈرتے ڈرتے ذرا اوپر کیا۔

”اس کو مالش بولتے کیا رہے نکمے!“ ان کی ڈانٹ میں لگاوٹ بھیجی۔

رحمت نے سرخ ہوتے کانوں سے پھر اور سنا۔ ذرا ہو ر اُپڑ۔

”ذرا ہو ر اُپڑ۔“

گہرے اودے رنگ کا ہنگا اور گہرے رنگ کی ساڑی ذرا اوپر ہوئی اور
جیسے بادلوں میں بجلیاں کوندیں ۔

”ذرا ہور اُپر۔“

”ذرا ہور اُپر۔“

”ذرا ہور اُپر۔“

”ذرا ہور اُپر۔“

تلکاکر صندل کے تیل سے بھری کٹدی اٹھا کر رحمت نے دور پھینک دی
اور اس بلندی پر پہنچ گیا۔ جہاں تک ایک مرد پہنچ سکتا ہے۔ اور جس کے بعد ذرا
ہور اُپر کہنے سننے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی ۔

دوسرے دن پاشا دلہن پھول کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ صندل ان کی
من پسند خوشبو تھی۔ صندل کی مہک سے ان کا جسم لدا ہوا تھا۔ نواب صاحب
نے رحمت سے پانی مانگا تو وہ بڑے ادب سے چاندی کی طشتری میں چاندی کا
گلاس رکھ کر لایا۔ جھک کر پانی پیش کیا تو انھیں ایسا لگا کہ وہ صندل کی خوشبو
میں ڈوبے جا رہے ہیں۔ گلاس اٹھاتے اٹھاتے انھوں نے مڑ کر نگاہ کو دیکھا۔ جو ریشمی
گند گہرے بستر میں اپنے بالوں کا سیاہ آبشار پھیلائے کھلی جا رہی تھیں۔ ایک
فاتح مسکرا ہٹان کے چہرے پر تھی ۔

وہ انھیں سناتے کہ رحمت کی طرف دیکھتے ہوئے زور سے بولے ”کل تیرے
کو گاؤں جانے کا ہے۔ وہاں پورا ایک فشتی کی ضرورت ہے بول کے۔“

رحمت نے سر جھکا کر کہا ۔ ”جو حکم سرکار۔“

نواب صاحب نے پاشا دلہن کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ ایک فاتح کی

مسکراہٹ -

درد گھنٹے یوں پاشا دلہن اپنی شان دار حویلی کے بے پناہ شان دار بادچی

خانے میں گھڑی ماما کو ہدایت دے رہی تھیں -

”دیکھو ماما بی، رائے یہ اپنی زبیدہ کا چھو کر اہے ناشتر ف - اس کو ذرا

اچھا کھانا دیا کرنا - آج سے یہ میرے پاواں دبایا کریں گا - ماش کرنے کو ذرا

ہاتھ پاواں میں دم ہونے کو ہوتا نا؟“

”برو برو لتے بی پاشا آپ؟ ماما بی نے اصلی گھی ٹپکتا انڈوں کا حلوا شتر ف

کے سامنے رکھتے ہوئے پاشا دلہن کے حکم کی تعمیل اسی گھڑی سے شروع کر دی -



اترن

نکو اللہ، میرے کو بہت شرم لگتی ۔

”ایو اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ میں نیٹس اتاری کیا اپنے کپڑے؟“
 ”اوں —“ چکی شرمائی

”اب اُستارتی کی بووں اتانی کو؟“ شہزادی پاشا جن کی رگ رگ میں
 حکم چلانے کی عادت رچی ہوئی تھی — چلا کر بولیں۔

چکی نے کچھ ڈستے ڈستے، کچھ شرماتے شرماتے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں
 سے پہلے تو اپنا کرتا اتارا، پھر پا جامہ — پھر شہزادی پاشا کے حکم پر بھاگوں بھر
 سب میں ان کے ساتھ کود پڑی۔

دونوں نہا چکیں، تو شہزادی پاشا ایسی محبت سے جس میں غرور اور مالکن
 پن کی گہری چھاپ تھی، مسکرا کر بولیں ”ہوریہ تو بتا کی اب تو کپڑے کون سے

پین رٹی ؟

”کپڑے ۔ ؟“ چمکی بے حد تنانت سے بولی ۔ ”یہی اپج میسرانیا کرتا پاچا ہمارا۔“

”یہی اپج ؟“ شہزادی پاشا حیرت سے چلا کر ناک سکوڑتے ہوئے بولیں ۔ ”اتے گندے، بدبو والے کپڑے؟ پھر پانی نہانے کا فائدہ؟“ چمکی نے جواب دینے کی بجائے الٹا ایک سوال جڑ دیا ۔ ”ہو رہا آپ کیا پین رٹے پاشا؟“

”ہیں ؟ شہزادی پاشا بڑے اطمینان اور فخر سے بولیں
”وہ میری بسم اللہ کے دخت چمک چمک کا جوڑا دادی ماں نے بنائے تھے، وہی اپج ۔ مگر تو نے کاٹے کو پوچھی؟“
چمکی ایک لمحے کو تو سوچ میں پڑ گئی، پھر سنسن کر بولی ”میں سوچ رہی تھی.....“ وہ کہتے کہتے رک گئی ۔

”کیا سوچ رہی تھی؟“ شہزادی پاشا نے بے حد تجسس سے پوچھا
ایک دم اُدھر سے اُتالی کی تیز چنگھاڑ سنائی دی ۔
”ہو پاشا، یہ میرے کو حمام میں سے بھگالے کو تم اس اجاڑ مارچوٹی کے ساتھ کیا مٹانے مار لیتے بیٹھیں؟ جلدی نکلو، نیش تو بی پاشا کو جا کر بولیتوں“
اپنی سوچی ہوئی بات چمکی نے جلدی سے کہہ سنائی ۔ ”پاشا میں سوچ رہی تھی کہ کبھی آپ ہو رہیں“ اور صنی بدل ”بہناں بن گئے تو آپ کے کپڑے میں بھی پہن لے سکتی نا؟“

میرے کپڑے؟ تیرا مطلب ہے کہ وہ سارے کپڑے جو میرے

صندوقاں بھر بھر کر رکھے پڑے ہیں؟“
جواب میں چکی نے ذرا ڈر کر سر ملایا۔

شہزادی پاشا ہنستے ہنستے دہری ہو گئی۔ ”ایو کتنی بے خوف چھو کری ہے! آگے تو تو ذکرانی ہے۔ تو تو میری اُترن پہنتی ہے، ہو ر عمر بھر اُترن ہی پہنیں گی۔“ پھر شہزادی پاشا نے بے حد محبت سے جس میں غرور اور فخر زیادہ اور خلوص کم تھا، اپنا ابھی ابھی کا، ہانے کے لئے اُتارا ہوا جوٹا اٹھا کر چکی کی طرف اچھال دیا۔

”یہ لے اُترن پہن لے۔ میرے پاس تو بہت کپڑے ہیں۔“
چکی کو غصہ آ گیا۔ ”میں کانے پہنوں، آپ پہنونا میرا یہ جوڑا۔“ اس نے اپنے میلے جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔

”شہزادی پاشا غصے سے بنکاری،“ اتابی! اتابی!...“

اتابی نے زور سے درد اڑنے کو بھڑ بھڑایا اور دروازہ جو صرف ہلکا سا بھڑا ہوا تھا، پاٹوں پاٹ کھل گیا۔

”اچھا تو آپ صاحبان ابھی تک ننگے اچ کھڑے دے ہیں! اتابی ناک پر انگلی رکھ کر بنادٹی غصے سے بولیں۔“

شہزادی پاشا نے جھٹ اسٹنڈ پر ٹنگا ہونٹ نرمل گلابی تولیہ اٹھا کر اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ چکی یوں ہی کھڑی رہی

اتابی نے اپنی بیٹی طرف ذرا غور سے دیکھا۔ ”ہو تو پاشا لوگاں کے حمام میں کاٹے کو پانی نہاتے کو آن مری؟“

”یہ انوں شہزادی پاشا نے بولے کی تو بھی میرے ساتھ پانی نہا۔“

اتابی نے ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ پھر جلدی سے اسے حمام سے باہر کھینچ کر بولیں ”جل، جلدی سے جا کر ذکر خانے میں۔“ نیٹس تو سردی وردی لگ گئی تو مرے گی۔“

”اب یہ چکٹ گوند کپڑے نکو پین، وہ لال پٹی میں شہزادی پاشا پرسوں اپنا کرتا، پاجامہ دے تھے، وہ جا کو پین لے۔“

وہیں سنگی کھڑی کھڑی وہ سات برس کی ننھی سی جان بڑی گہری سوج کے ساتھ رک رک بولی، اسی حب میں ہور شہزادی پاشا ایک برابر کے ہیں تو انہ میری اُترن کیوں نیٹس پہنتے۔؟

”بھیر ذرا، میں تما کو جا کے بولیتوں کی چکی میرے کو ایسا بولی۔۔۔“ لیکن اتابی نے ذکر اسے گود میں اٹھالیا، آگے پاشا اُٹنے تو چھناں پگل ہو لی ہو گئی ہے۔ ایسے دیوانی کے باتاں کاٹے کو اپنے تما سے بولتے آپ؟ اس کے سنگات کھیلنا، نہ بات کرنا، چپ اس کے نام پو جوتی مار دیو آپ؟ شہزادی پاشا کو کپڑے پہنا کر، کنگھی چوٹی کر کے کھانا، دانا کھلا کر جب سارے کاموں سے نچنت ہو کر اتابی اپنے کمرے میں پہنچیں تو دیکھا کہ کہ چکی ابھی تک ننگا جھاڑ بنی کھڑی ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ آتے ہی اکھوں نے اپنی بیٹی کو دھنکنا شروع کر دیا

”جس کا کھاتی اُسی سے لڑائیاں مول لیتی۔۔۔ چھناں گھوڑی! ابھی کبھی بڑے سرکار نکال باہر کر دیئے تو کدھر جائیں گے اِتے نخرے؟“ اتابی کے حسابوں تو یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ وہ شہزادی پاشا کو دود پلانے کے واسطے رکھی گئی تھیں، ان کے کھانے پینے کا معیار تو لازماً وہی تھا

جو بیگمات کا تھا کہ بھٹی آخر وہ نواب صاحب کی اکلوتی بچی کو اپنا دودھ پلاتی تھیں
 کپڑا لٹا بھی بے حساب تھا کہ دودھ پلانے والی کے لئے صاف ستھرا رہنا
 لازمی تھا اور سب سے زیادہ مرنے تو یہ تھے کہ ان کی اپنی بچی کو شہزادی پاشا
 کی بے حساب اترن ملتی تھی۔ کپڑے لٹے ملنا تو ایک طے شدہ بات تھی، حد
 یہ کہ اکثر چاندی کے زیور اور کھلونے تک بھی اترن میں شے دئے جاتے
 تھے۔ ادھر وہ حراذ تھی کہ جبکہ ذرا ہوش سنبھال رہی تھی یہی ضد کئے جاتی تھی
 کہ میں بی پاشا کی اترن کیوں پہنوں؟ کبھی کبھار تو آئینہ دیکھ کر بڑی سو جھو بوجھ
 کے ساتھ کہتی ”امنی میں تو بی پاشا سے بھی زیادہ خوبصورت ہوں نا؟ پھر تو
 انوں میری اترن پہننا۔“

اتنا بی ہر گھڑی ہولتی تھیں۔ بڑے لوگ تو بڑے لوگ ہی ٹھہرے۔
 اگر کسی نے سن گن پالی کہ موٹی اتنا نا اصل کی بیٹی ایسے ایسے بول بولتی ہے تو
 ناک چوٹی کاٹ کر نکال باہر نہ کر دیں گے؟۔ ویسے بھی دودھ پلانے کا زمانہ
 تو مدت ہوئی بیت گیا تھا۔ وہ تو ڈیوڑھی کی روایت کہیے کہ اتنا لوگوں کی مرے
 بعد ہی چھٹی کی جاتی تھی۔ لیکن قصور بھی معاف کئے جانے کے قابل ہو تو ہی معافی
 ملتی ہے۔ ایسا بھی کیا؟ اتنا بی نے چپکے کے کان مروڑ کر اسے سمجھایا۔
 ”گے سے کچھ بولی تو یاد رکھ۔ تیرے کو عمر بھر بی پاشا کی اترن پہننا
 ہے۔ سمجھی کی نہیں، گدھے کی ادبیاد!“

گدھے کی ادبیاد نے اس وقت زبان سی لی لیکن ذہن میں لا دیا
 ہی رہا۔

تیرہ برس کی ہوئیں تو شہزادی پاشا کی پہلی بار نماز قضا ہوئی۔ آٹھویں

دن گل پوشی ہوئی تو ایسا زرتار، جھم جھماتا جوڑا ملنے سلوایا کہ آنکھ ٹھیرتی نہ تھی جگہ جگہ سونے کے گھنگھروں کی جوڑیاں ٹنکوائیں کہ جب بی پاشا چلیں تو چھین پاشیں سنی بختیں۔ ڈیوڑھی کے دستور کے مطابق وہ حد سے سوا قیمتی جوڑا بھی اترن میں صدقہ دے دیا گیا۔ اتنا بی خوشی خوشی وہ سوغات لے کر نہیں تو چمکی جو اپنی عمر سے کہیں زیادہ سمجھ دار اور حساس ہو چکی تھی، دکھ سے بولی: ”اسنی مجبوری نلے لینا ہو رہا ہے مگر آپ ایسے چیزاں کو لے کو خوش مت ہو کر“ ”اگے بیٹا۔“ وہ رازداری سے بولیں: ”یہ جوڑا اگر بکانے کو بھی بیٹھے تو دوسو کھلار روپے تو کہیں نہیں گئے۔ اپن لوگاں نصیبے والے ہیں کہ ایسی ڈیوڑھی میں پڑے۔“

”اسنی: چمکی نے بڑی حسرت سے کہا: میرا کیا جی بولتا کی میں بھی کبھی بی پاشا کو اپنی اترن دیوں؟“

اتنا بی نے سر پیٹ لیا۔ اگے تو بھی اب جوان ہو گئی گے ذرا غل بکڑ، ایسی ویسی باتاں کوئی سن یا تو میں کیا کر دوں گی ماں۔ ذرا میرے بڑھے چونڈے پور جم کر۔“

چمکی ماں کو روتا دیکھ خاموش ہو گئی۔

مولوی صاحب نے دونوں کو ساتھ ہی ساتھ قرآن شریف اور اردو قاعدہ شروع کرایا تھا۔ بی پاشا نے کم اور چمکی نے زیادہ تیزی دکھائی۔ دونوں نے جب پہلی بار قرآن شریف کا وعدہ ختم کیا تو بڑی پاشا نے انداز غنایت چمکی کو بھی ایک ہلکے کپڑے کا نیا جوڑا سلوا دیا تھا۔ ہر چند کہ بعد میں اسے

بی پاشا کا بھاری جوڑا بھی اترن میں مل گیا تھا لیکن اسے اپنا وہ جوڑا
جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اس جوڑے سے اسے کسی قسم کی ذلت محسوس نہیں ہوتی
تھی۔ ہلکے زعفرانی رنگ کا سوتی جوڑا۔ جو کتنے ہی سارے جگمگاتے بس بس
کرتے جوڑوں سے سوا تھا۔

اب جبکہ خیر سے شہزادی پاشا ضرورت بھر پڑھ لکھ بھی چکی تھیں، جون
بھی ہو چکی تھیں، ان کا گھر بسانے کی فکریں کی جا رہی تھیں۔ ڈیوڑھی ہنسارو
دنبیلوں، بیو پاروں کا مسکن بن چکی تھی۔ چمکی یہی سوچے جاتی کہ وہ تو شادی کے اتنے
بڑے منگے کے دن بھی اپنا وہی جوڑا پہنے گی جو کسی کی اترن نہیں تھا۔

بڑی پاشا، جو واقعی بڑی مہربان خاتون تھیں، ہمیشہ اپنے نوکر وں کا اپنی
اولاد ہی کی طرح خیال رکھتی تھیں۔ اس لئے شہزادی پاشا کے ساتھ وہ چمکی کی شادی
کے لئے بھی اتنی ہی فکر مند تھیں۔ آخر نواب صاحب سے کہہ سن کر انھوں نے
ایک مناسب لڑکا چمکی کے لئے تلاش کر ہی لیا۔ سوچا کہ شہزادی پاشا کی شادی
کے بعد اسی جھوڑ بھکے میں چمکی کا بھی عقد پڑھا دیا جائے۔

اس دن جب شہزادی پاشا کے عقد کو صرف ایک دن رہ گیا تھا اور
ڈیوڑھی مہارازن سے ٹھسا ٹھس بھری پڑی تھی۔ اور لڑکیوں کا ٹڈی دل ڈیوڑھی
کو سر پہ اٹھائے ہوئے تھا۔ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی شہزادی پاشا
بیروں میں مہندی لگواتے ہوئے چمکی سے کہنے لگیں ”تو سسرال جائے گی تو تیرے
پیروں کو میں مہندی لگاؤں گی۔“

”ایو خدا نہ کرے!“ اتالی نے پیار سے کہا۔ ”اس کے پاؤں آپ کے دشمنوں
چنبوٹی۔ آپ ایسا بولے سولیں ہے۔ بس اتنی دعا کرنا پاشا کہ آپ کے دوہلے

میاں ولیا شریف دولہا اس کا نیکل جائے :

” مگر اس کی شادی کب ہوئی جی ؟ ” کوئی چلیلی لڑکی پوچھ بیٹھی ۔

شہزادی پاشا کا وہی بچپن والی غزور بھری ہنسی ہنس کر بولیں ” میری اتنی ساری اُترن نکلے گی تو اس کا جہیز تیار سمجھو... ”

اُترن ۔ اُترن ۔ اُترن ۔ کئی ہزار سوئیوں کی باریک باریک نوکیں جیسے اس کے دل کو چھید گئیں ۔ وہ آنسو پیتے ہوئے اپنے کمرے میں آکر چپ چاپ پڑ گئی ۔

سیر شام ہی لڑکیوں نے پھر ڈھولک سنبھال لی ۔ ایک سے ایک دہیات گانا گایا جا رہا تھا ۔ پچھلی رات رت جگا ہوا تھا ۔ آج پھر ہونے والا تھا ۔ پر لی طرف صحن میں ڈھیروں چولہے چلائے ، باد چلی لوگ انواع و اقسام کے کھانے تیار کرنے میں مشغول تھے ۔ ڈیوڑھی پر رات ہی سے دن کا گمان ہو رہا تھا ۔

چکی کا روتا ہوا حسن نارنجی جوڑے میں ادر کھل اُٹھا ۔ یہ جوڑا وہ جوڑا تھا جو اُسے احساس کمتری کے پاتال سے اُٹھا کر عرش کی بلندیوں پر بٹھا دیتا تھا ۔ یہ جوڑا کسی کی اُترن نہیں تھا ۔ نئے کپڑوں سے سلا ہوا جوڑا ، جو اُسے زندگی بھر میں ایک ہی بار نصیب ہوا تھا ۔ ورنہ ساری عمر تو شہزادی پاشا کی اُترن پہنتے ہی گزری تھی ۔ اور اب چونکہ جہیز بھی تمام تر ان کی اُترن ہی پر مشتمل تھا اس لئے باقی کی ساری عمر بھی اسے اُترن ہی استعمال کرنی ہوگی ۔

” لیکن بی پاشا ۔ ایک سیدزادی کہاں تک پہنچ سکتی ہے ۔ یہ تم بھی دیکھ لینا ۔ تم سے ایک پرانی چیز مجھے استعمال کرنے کو دئے نا ؛ اب

تم دیکھنا....“

ملیدے کا تھال اٹھائے وہ دوہا والوں کی کوٹھی میں داخل ہوئی — ہر طرف چراغاں ہو رہا تھا۔ یہاں بھی وہی چہل پہل تھی جو دوہا والوں کے محل میں تھی۔ صبح ہی عقد خوانی جو تھی۔

اتنے ہنگامے اور اتنی بڑی کوٹھی میں کسی نے اس کا نوٹس بھی نہ لیا پوچھتی پاچھتی وہ سیدھی دوہا میاں کے کمرے میں جا پہنچی۔ بلدی مہندی کی ریتوں رسموں سے تھکے تھکائے دوہا میاں اپنی مسہری پر دراز بٹھے۔ پردہ ہلاتا وہ مڑے۔ اور دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

گھٹنوں تک لمبا زعفرانی کرتا۔ کسی کسی پنڈیوں پر منڈھا ہوا تنگ پا جامہ۔ ہلکی ہلکی کاندانی کا کڑھا ہوا زعفرانی دوپٹہ۔ روتی روتی، بھیگی بھیگی گلابی آنکھیں۔ چھوٹی آسینوں والے کرتے میں سے جھانکتی گداز باہنیں۔ بالوں میں موتیا کے گجرے پڑے ہوئے۔ ہونٹوں پر ایک قاتل سی مسکراہٹ — یہ سب نیا نہیں تھا، لیکن ایک مرد جس کی پچھلی کئی راتیں کسی عورت کے تصور میں بیتی ہوں۔ شادی سے ایک رات پہلے بہت خطرناک ہو جانا ہے۔ چلے وہ کیسا ہی شریف ہو۔

رات جو دعوت گناہ ہوتی ہے

تنہائی جو گناہوں کی بہت بڑھاتی ہے۔

چمکی نے انھیں یوں دیکھا کہ وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے۔ چمکی جان بوجھ کر مونہہ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ تھلائے سے اپنی جگہ سے اٹھے، اور ٹھیک اس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں کے گوشوں سے چمکی نے انھیں یوں

دیکھا کہ وہ ڈھیر ہو گئے۔

تمہارا نام؟ انہوں نے تھوک نکل کر کہا۔

”چکی!“ اور ایک ٹھیکیلی سہسی نے اس کے پیارے پیارے چہرے کو چاند

کر دیا۔

”واقعہ تم میں جو چمک ہے اس کا تخاصل ہی تھا کہ تمہارا نام چکی ہوتا...“

انہوں نے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا۔ خالص مردوں والے

لہجے میں، جو کسی لڑکی کو پٹالے سے پہلے خواہ مخواہ کی ادھر ادھر کی ہانکتے ہیں

لرزتے ہوئے اپنا ہاتھ شانے سے ہٹا کر اس کے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے بے ہلے

”یہ تھال میں کیا ہے؟“

چکی نے قصداً اُن کی ہمت بڑھائی۔ ”آپ کے واسطے ملیدہ لائی ہوئی

رات جگا تھانہ رات کو! اور اس نے تلوار کے بغیر انھیں گھائل گھائل کر دیا۔

”مونہ بیٹھا کرنے کو۔۔۔ وہ مسکرائی۔

”ہم ملیدے ولید سے مونہ بیٹھا کرنے کے خائل نہیں ہیں۔۔۔ ہم تو۔

.... ہاں اور انہوں نے ہونٹوں کے شہد سے اپنا مونہ بیٹھا کرنے کو

اپنے ہونٹ بڑھائیے۔ اور چکی ان کے باہنوں میں ڈھیر ہو گئی۔ ان کی

پاکیزگی لٹنے۔ خود لٹنے۔ اور انھیں لٹنے کے لئے۔

وداع کے دوسرے دن ڈیوڑھی کے دستور کے مطابق جب شہزادی

پاشا اپنی اُترن اپنا سہاگ کا جوڑا اپنی اتا اپنی کھلائی کی بٹیا کو دیے گئیں

تو چچی نے مسکرا کر کہا۔ ” یا شا میں میں
 ” میں زندگی بھر آپ کی اُترن استعمال کرتی آئی —

مگر اب آپ بھی“

اور وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگی۔ ” میری استعمال کری ہوئی چیز اب
 زندگی بھر آپ بھی“ اس کی ہنسنی کھتم ہی نہ تھی ۔

سب لوگ یہی سمجھے کہ بچپن سے ساتھ کھیلی سہیلی کی جدائی کے
 غم نے عارضی طور سے چچی کو پاگل کر دیا ہے ۔



بھوک

بڑی پاشا کا غصہ اپنے شباب پر تھا
 ”اُچار اُنے دیوان صاحب اتنا سا کام اب تک کر کو نہیں دئے۔ کتے
 دئے بول بول کے بھیج دی پرائوں کے کاناں جیسے پٹ بیٹیں۔ کیا پورے محلے
 پڑے ہیں۔ ایک بھی پیٹ والی سیدانی بیٹیں مل رٹی ہوئیں گی۔“
 مغللابی بوا بادیام، کشتش، منقہ چھوہارے، میوٹوں اور غفران کے ڈھیر ہیں
 ڈوبی بیٹھی تھیں۔ وہیں سے رک ذرا سراونچا کر کے بولیں ”اوٹی پاشا اتنا گھاہ برے
 بھی نہ کھتا تھا ابھی دلہن پاشا کی زچگی کو خود دس پندرہ دن پڑے ہیں بلچ جائیں گی۔
 گلی گلی سیدانیاں پڑے بیٹیں ایک چھوڑ دس مل جائیں گے۔“
 تم بھی کیا باتاں کرتے مارا۔ ایک چھوڑ دس مل رئے۔ میں بولتیوں
 ایچ مل جائے سو غنیمت۔ ایک دن بھی دیر سے ملی تو ناسخ بے چاری دلہن کو
 تکلیف۔“

مغلانی بولنے ذرا گڑبڑا کر بڑی پاشا کو دیکھا

”ہو پاشا نو مہینے پیٹ میں رکھے سو تکلیف نہیں ہوئی۔ اک ذرا دودھ

پلا لینے سے کائے کی تکلیف ہو جائیں گی؛ ماں پھر داں ہوتی اپن ہے۔

ہو پاشا کوئی میرے سے پوچھے تو میں ہی اپن بولوں کی سب سے اچھا دودھ اپنی
ماں کا۔“

بڑی پاشا نے ذرا تیر بدل کر انھیں دیکھا۔ ”یو اور سنو۔ ہو جی

تے اتنا نہیں معلوم دہن کو سو لہواں بھر کو ابھی اپن ستر ہواں لگا۔ اتنی سی جان دھان

پان۔ کیا آنے بچے کو دودھ پلائیں گی۔؟ اول اپن تو کیسی زرد زعفران ہو کر رہ

گئی۔ اس دن تے سنے نہیں بڑے سرکار جو ڈاکٹر نی بھجائے تھے، اُن نے دیکھ

کو کیا بولی۔؟ بہت کم طاقت ہے۔“

مغلانی بوا کشمش کے تنکے چنتی چنتی اسی بے نیازی سے کہے گئیں۔ ”دوٹی

پاشا یہ ڈھونگ دھوئے سو ب موئے ڈاکٹر ان پھیلائے سو میں۔ نہیں تو کدو

کی بیل کو بھی اس کا پھل بھاری نہیں جاتا۔ یہ تو انسان اپن ہے۔“

بڑی پاشا نے گھور کر مغلانی بوا کو دیکھا۔ ان کی بزرگی اور سفید سر آڑے

آجاتا تھا، ورنہ ایسے موقعوں پر ان کا جی چاہتا بڑھیا کا چونڈا پکڑ کر ڈیوڑھی سے

نکال باہر کریں۔ یہ کوئی آج کی بات نہیں تھی جب سے وہ بیاہ کر اس ڈیوڑھی میں آئی

تھیں، تب سے ہی زنان خانے میں ہر بات میں مغلانی بوا کا سکہ چلتا تھا۔ بڑے

سرکار کے والد جب تک زندہ تھے، وہ بھی اس نوکر شاہی سے واقف تھے

کبھی کبھار وہ مذاق میں منہس کر کہہ بھی دیتے تھے، ”مغلانی بوا، اب کبھی سرکار سے

ان کا اشارہ حضور نظام فرماں روا کے دکن کی طرف ہوتا تھا، طاقت ہوئی تو

ہم ان کو مشورہ دیں گے کہ آپ ہماری مغلائی بوا کے نام کا سیکہ چلا دیو۔“
 مغلائی بوا جانے کون سا آب حیات پی کر آئی تھیں کہ بڑی پاشا کے دیکھتے
 دیکھتے چالیس برس ان پر سے جیسے چالیس ہینے ہو کر نکل گئے تھے۔ وہی سیاہ
 بال، وہی مستی بھرے ہوئے دانت وہی مضبوط کاٹھی، اور وہی عمل دخل
 — سارے پاشا لوگ ان سے ایسے دیتے تھے جیسے سچ مچ وہی گھر کی مالک تھیں
 البتہ بڑی پاشا سے ان کی کبھی کبھار بڑی تکرار چلتی تھی۔ ڈیوڑھی میں کتنے زچگی
 جاپے ہوتے تھے۔ کتنی انامیں، کتنی کھلاٹیاں مامد کی جاتیں، کوئی حساب ہی نہ تھا۔
 لیکن ہر بار مغلائی بوا کا یہی کہنا ہوتا ”ماں کا دودھ ضروری نہ ہوتا تو اللہ میاں عورت
 کے سینے میں دودھ اتار تاچ کیوں؟“ مگر ان کی وہی حالت تھی کہ چاکر لاکھ کا نہ
 مالک خاک کا۔“

پالکڑیوں، کنیزوں، اور رکھیل چھو کریوں کی ایک پلیٹن کی پلیٹن بیٹھی زچہ اور
 کھلائی کی خوراک صاف کرنے میں نہہک تھی کہ اتنے میں باہر سے خواجہ سرا امدد
 وارد ہوئے ”مغور وہ دیوان صاحب تو بڑے سرکار کے ساتھ بگھی پر کہیں
 ترشیف لے گئے ہیں۔ اس واسطے یہ خادم کچھ فرمانا چاہتا ہے۔“
 خواجہ سرا جو دہلی کی ایک بارات کے کچھ اہل زبان حضرات کے ساتھ چند
 روز گزار کر خود بھی ”زبان دان“ بن چکے تھے، ساری ڈیوڑھی کے لئے تفریح کا سامان
 تھے۔ بڑی پاشا زیر لب مسکرا کر بولیں۔

”اچھا ہوا دیوان صاحب ترشیف لے گئے۔ آپ نیٹیں، نیٹیں تو یہاں
 کے سب کا ماں چوہٹ ہو جاتے۔ بولو کیا فرمانا ہے؟“
 ”جی — وہ ایک سیدانی شکر ام میں بیٹھ کر ایک مرد لے ہو زنائی کے

سافہ آئے بیٹھیں۔ کرایہ بھی دینا ہے۔ ہور انوں آپ سے ملنا بھی ہے۔ بولتے
یہ چھٹی انوں دئے سو ہے۔“

بڑی پاشا نے مڑی مڑی چھٹی کو کھول کر دیکھا۔ ڈیوڑھی کا ہی پتہ تھا۔
دیوان صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔ بڑی پاشا خوش ہو کر بولیں۔ ”مغلانی بوا کھو
تو وہ دیوان صاحب جگہ جگہ بول کر رکھے تھے سو ان میں سے کوئی آیا کی۔“
مغلانی بوا کی۔ سہری میں ایک جوان سی لڑکی، بڑا سا پیٹ لئے، تھکی تھکا
ایک بڑی بی سن کا سفید سر لئے، میلے کچیلے کپڑے پہنے اور ایک بڑے سیاں جھکے
جھکے سے، جیسے دکھوں کا گھڑ سر پر دھرا ہو کر سراٹھا کر چلنے نہ دیتا ہو۔ زنان
خانے میں داخل ہوئے تو بڑی پاشا وہیں سے ذرا ترش ہو کر پھٹکاریں ”آئی بڑے
میاں تم ادھیچ رہو۔ یہاں چھو کریاں گوشہ پردہ ہے۔“

”جیسی حضور کی مرضی۔“ وہ وہیں ٹھٹھک گئے۔ بڑی بی اپنی بیٹی کا
ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھیں۔ لڑکی نے چاندی کے تھالوں میں رکھے ہوئے بادام،
اور کشمش، چھوہارے، منقہ، اور مکھانوں کے ڈھیر کو دیکھا اور زعفران کی بے پناہ
خوشبو کو گھونٹ گھونٹ بیٹی وہیں ننگے فرش پر بیٹھ گئی۔ بڑی بی نے سہم کر بیٹی کی
وکالت کی۔ ”میں کہوں تو ان مہینہ بھرا جا رہا ہے۔ تھکی تھکی جاتی ہے۔“

”کچھ پروا نہیں۔“ بڑی پاشا رساں سے بولیں۔ ”ڈائی کتے دناں تباہی؟“

”بس اسی ہفتے دس دن میں چاند چلے گا۔“ بڑی بی خوشی خوشی بولیں۔

بڑی سرکار نے چونک کر انھیں دیکھا اور پوچھا ”کہاں کے رہنے والے جیتے؟“

جنی۔ ہم خانماں برباد اسی دہلی کے ہیں جو ہزار بار اُجڑی اور ہزار بار بسی

۔ اب قسمت نے یہاں لا پھینکا ہے۔ اس سرکار کا نام سن کر چلے آئے تھے جس

کی بادشاہت میں ”

بڑی پاشابات کاٹ کر ناگواری سے بولیں ”ابا کہتے بکواسی ہیں جی تے
— چپکے چپکے پٹ پٹ لگا دیئیں۔ میں جو جو پوچھوں، بس اُتے کا جواب دینا“
”بہت بہتر میری سرکار۔“ بڑی بی بغیر بُرا مانے بولیں۔

”تمہارا خاندان کون سا ہے ہو رہا تمہارے سسرال کا کون سا؟“

”جی سرکار، ہم لوگ نجیب الطرفین — خاک چاٹ کر کہتی ہوں کہ ہمارا سلسلہ
آل رسول، خاندانِ سادات سے ملتا ہے۔ میرا میکہ بھی سید تھا۔ سسرال
بھی، خدا کی مہربانی سے بیٹا کو بھی سسرال سید گھرانہ ہی ملا۔ تین بیٹریں اور تین
بیٹریں نیچے تک ہمارے خاندان میں کہیں کھوٹ نہیں — نوکری کی، مزدوری کی،
چاکری کی، لیکن شکر اس مالک کا اور کرم اس رسول کا کہ کبھی کسی کی دی خیرات نہیں
لی۔ نہ صدقہ کھایا نہ زکوٰۃ لی — دو ہاتھ پاؤں چلا کر ہی پیٹ بھرا سرکار —
جس کے لئے خدا اور اس کے رسول نے بھی کوئی ممانعت نہیں فرمائی ہے۔“
کھٹیک ہے — ہم نا بھی تم کو نوکری کے واسطے اچ بلا بھیجیں، ہمارے
پوتے کو یا پوتی کو — جو بھی اللہ دیا سو — تمہاری چھو کری سال بھر دودھ پلانا
مگر اپنے بچے کو ادھکا دودھ پلانا کہتے۔

”جی — پہلی بار لڑکی بغیر مخاطب کئے، خود سے بول پڑی

”چپکی رہو زینب — بڑوں کے بیچ میں زبان نہیں ہلایا کرتے۔“ ماں

نے بیٹی کو گھر کی دی اور وہ دہیں سہم گئی۔

بڑی پاشانے سنانا شروع کیا — ”پانچ روپے مہینہ تنخواہ، کھانا پینا ہمارا

طرف۔ صبح اچ صبح بڑا گلاس بھر کو بادام، زعفران، اقد گڑ ملا ہوا دودھ۔ ہمارے

وہاں زچہ کو ٹھنڈی رہتی بول کو شکر نہیں دیتے۔ پھر دو گھنٹے سے ناشتہ — دوانڈے پراٹھے، چوزے کا شوربہ، — پھر کھانے سے پہلے بھوک دوک لگی تو طشتری بھر کو میوے، مکھانے، تلا ہوا گوند، بادام، کشمش، دوپہر کے کھانے پورے ایک مرغی بکرے کا شوربہ، روغنی روٹی، — چاول ہمیں زچہ اور اتا کو نہیں دیتے۔ ٹھنڈے ہوتے بول کو — چائے ایسی بھینس کا دودھ جس کو ہرے لوگاں خاص زچہ کے واسطے پالتے کی — سولٹے میوے اور تھوڑی سرکی کے اس کو کچھ نہیں کھلاتے — رات کو بچے کا دودھ سہتم، موٹے نہ ہونے کر کے بہت ہلکی غذا ہے دیتے۔ بس پرندوں کا بہت گلا ہوا گوشت دلے میں پکا کو۔ اور رات کو سوتے دخت دی دودھ —

بڑی بی اور زینب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کوشش کرتی تب بھی شائد ہی ملے بند نہ پاتی۔

”اتنا سوب اس واسطے کی ہمارا بچہ طاخت ور ہونا — اور ایک بات یہ کی برتناں ہے سوب چاندی کے استعمال کرتے۔ حکیم صاحب بولتے چاندی میں بہت طاخت رہتی۔ ہو کر پڑے بھی، سچ دیں گے، روز صبح تلی ہو ر صندل کے تیل سے مالش کر کے ایک خاتمہ نہلا میں لگی۔ تب بچہ گود میں لینا۔ غلیظ عورتاں ہم نہیں رکھتے۔

”بہت بہتر میری سرکار۔“ بڑی بی مارے ممنونیت کے دہری ہو کر بولیں۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا سرکار۔“ وہ ادھ مری سی زینب کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔ اس کا بھی یہ پہلا بچہ ہے سرکار۔ پہلے تو اچھی خاصی تندہ تھی لیکن کیا کہیں سرکار۔ پیٹ کا بچہ کیا کچھ نہیں مانگتا — پھر بھی شکر ہے

اس مالک کا سرکار، جس نے یہ زندگی دی۔“

بڑی پاشا نے قد سے ناگواری سے انھیں دیکھا۔ ”تمہاری زبان کتنی چلتی
جی۔ ذرا توجہ کرو۔“ وہ مغلانی ہوا سے مخاطب ہو گئیں۔ ”دیکھو وہ بہن
پاشا کے محل سے ملا ہوا جو کمرہ ہسکی نیش وہ اتنا کے واسطے خالی کرادلو۔“
ایک دم زینب تنگے فرش پہ لوٹ گئی۔ ننھی بچیوں کی طرح پاؤں ٹپک
ٹپک کر وہ چیخنے چلانے لگی ”میں اپنے بچے کا دودھ کسی دوسرے بچے کو نہیں
پلاؤں گی۔ نہیں پلاؤں گی۔ نہیں پلاؤں گی۔ اماں مجھ پہ یہ ظلم نہ کرو۔“
چاندی کے طشت میں میوے ملے دودھ کے گلاس، مرزع، بکرے۔
پرندوں کے گوشت سے بنے ہوئے لذیذ قورے، روغنی روٹیاں۔ پر اسٹھے
۔ ایک ایک کر کے اس کی نگاہوں کے سامنے اترنے لگے۔ وہ اسی طرح تھکی
تھکائی تنگے فرش پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ نہ چیخی تھی۔ نہ چلائی تھی پتہ نہیں اس کے دل کے
کن گوشوں سے چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ زبان تہ خاموش ہی تھی۔

سجے سجاوٹے کمرے میں جہاں ساز و سامان ایسا تھا جیسے کسی شاہ زادی
کا کمرہ ہو۔ زینب دم بخود کھڑی تھی۔ سفید مسہری ریشمی جالی سے مڑھی ہوئی
۔ شفاف چادر، تکیے اتنے نرم کہ جیسے اندر پھول بھرے ہوں۔ موٹا گدّا۔
پائنتی پر نفاست سے تہہ کی ہوئی کشمیری شال۔ انگاروں کی طرح گرم، مگر
پروں کی سی ہلکی۔ نیچے فرش پہ قالین۔ ایک طرف آئینہ، سنگار میز، بڑی مسہری
سے بہت کر چھوٹی سی مسہری۔ اسی نفاست اور اتھام سے جیسے کسی شہزادے
کے لئے ہو۔ !

”کس خوش نصیب کے لئے ہے یہ؟ زینب نے دکھے دل سے سوچا۔

تھوڑی دیر میں ایک خادمہ درزن کو لئے آجود ہوئی

”بی بی اپنا ناپ دلوادیو، تمہارے واسطے کپڑے تیار ہونا ہیں، تے

جب تک یہاں رہیں گے یہاں کے اچ کپڑے پہننا پڑیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ کسی معمول کی طرح ہر بات سنتی اور کرتی گئی۔

جب کمرہ سب لوگوں سے خالی ہو گیا تو بڑی بی نے اطمینان کی سانس

لی۔ ”خدا کا شکر ہے بیٹیا، بڑی سرکار نے تمہارے شوہر کے بارے میں

کوئی سوال نہ کیا۔“

”اگر انھیں پتہ چل جاتا کہ تم بیوہ ہو تو ممکن ہے وہ اسے برا شکوے سمجھیں

کہ ہمارے بچے کو ایسی عورت دودھ پلا رہی ہے جس کا شوہری نہیں تو تمہارے

نصیب ایسے نہ چمک پاتے۔“

”نہ زینب بھوٹ بھوٹ کر رودی۔“ اماں یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ اسے

نصیب کا چمکنا کہتے ہیں، میں ماں ہو کر اپنے بچے کو دودھ نہ پلا سکوں اس سے

بڑی نصیب کی تاریکی کوئی اور ہو سکتی ہے اماں؟“

”بیٹیا۔“ کئی بد نصیب بچے تو ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی ماؤں کو

ایک سرے سے دودھ اُترتا ہی نہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے پیدا ہوتے

ہی ان کی مائیں مرجاتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہارے ساتھ ایسی کوئی مجبوری

نہیں۔ اتنا کھا وگی تو اللہ بھر لو زندیوں جیسا دودھ بھی تمہیں دے گا۔ کہ اس بچے

کو پلا کر تھوڑا بہت اپنے بچے کو بھی پلا سکو۔ تم دل کیوں چھوٹا کرتی ہو؟

”اماں دل ہے ہی کس کجخت کے پاس جو چھوٹا یا بڑا ہو!“

جس سیلاب کو بڑی بی اتنی دیر سے روک رہی تھیں۔ جیسے پھوٹ پڑا۔
 ایک دم انھوں نے زینب کو سینے سے لگا لیا۔ آنسوؤں نے ان کی گویائی چھین سی لی۔
 ”آج تمہارا شوہر ہوتا تو.... مگر اس کی غیرت تو ایک جہا بھی نہ سہا سکتی۔
 — تمہارے آبا نے بس یہی تو کہا تھا کہ اللہ ایسوں کو اولاد دیتا ہی کیوں ہے جو
 اسے پال بھی نہیں سکتے۔ غریبی بڑی تو ہوتی ہے بٹیا مگر ایسا بھی کیا کہ اپنی جان
 ہی لے ڈالی۔ ہم نے بھی تو اک عمر اسی غربت میں کاٹ دی کہ صبح کھایا تو شام کی
 آس نہیں۔ شام ملا تو صبح کا یقین نہیں۔ آج وہ ہوتا تو دیکھتا کہ خدا کتنا بڑا ہے
 جہاں فاقے مرنے کی نوبت تھی وہاں شاہی نعمتیں! ایسی کہ انسان جن کا تصور بھی نہ
 کر سکے۔ پھر اوپر سے پانچ روپے ماہانہ — تمہاری تو زندگی ہی سنور گئی بٹیا۔“
 ”ٹھیک کہتی ہوا ماں، میری تو زندگی ہی سنور گئی —“ وہ آنسوؤں سے
 بھری، دکھ سے بھاری آواز میں بولی۔ ”کیا دنیا میں کھانا ہی سب کچھ ہوتا ہے؟“
 بڑی بی نے آنسوؤں سے چمکتی آنکھوں سے بیٹی کو دیکھا اور بالوں کو جھلا
 کر بولیں: ”بٹیا، ایک زمانہ ان بالوں پر سے ہو کر گزرا ہے۔ تب ہی یہ سفید
 ہو شے ہیں۔ اور اس زمانے نے یہی بتایا کہ سب سے بڑا دکھ بھوک ہے۔ سب سے
 بڑی خرابی بھوک ہے۔ سارا جھگڑا بھوک کا ہے بٹیا، بھوک نہ ہوتی تو خدا کو کون
 پوچھتا؟“

اُسی دم مغلانی بوا کرے کا پردہ اٹھا کر داخل ہوئیں اور زینب کو سمجھا
 کر بولیں: ”دیکھو بی بی — زچگی کے بعد سال بھرے تک، جب تک بچہ دودھ
 پیں گا تمہارے شوہر یہاں نہیں آنا۔“ پھر وہ بڑی بی کو دیکھ کر ذرا مسکرائیں
 — ”اب تھے بڑے بڑے تم کو کھول کو سمجھانے کی تو ضرورت نہیں نا؟“

دوسرا دن زینب کے لئے بڑا عجیب ثابت ہوا۔ پہلے ایک دائی اماں آئیں جو اُسے ٹٹول ٹٹول کر کہہ گئیں کہ دودن بھی مشکل سے نکلیں گے، پھر ایک کرسچین بیڈی ڈاکٹر آدھکی، جس نے ہر قسم کے معائنے کئے اور شوہر ماں، باپ سے لے کر سب ہی تک کی صحت کے بارے میں پوچھ گچھ کر ڈالی۔ بہت ساری گولیاں اور پیسے کی دوائیں اس کی سرہانے والی میز پر جمع ہو گئیں۔ یہ سب کچھ اس کے لئے بڑا عجیب غریب تجربہ تھا۔ اس کے یہاں تو سب سے بڑا ڈاکٹر حکیم جو کچھ تھا وہ امیر ہی والا تھا زچکی تاکہ لئے ڈاکٹر نے بہت ہلکی غذائیں زیادہ تر دودھ اور پھلوں کے رس تجویز کئے لیکن اس سارے معاملے میں، ان پڑھ دائی ماں زیادہ تجربہ کار ثابت ہوئیں اس لئے کہ اسے ڈیوڑھی میں آٹے تیسرا ہی دن تھا کہ شام ہوتے ہوتے وہ ایک ننھے منے سے لڑکے کی ماں بن گئی۔ چوبیس گھنٹے گزرنے پر اس نے وہ زندگانی بخش تناؤ اور درد اپنے سینے میں محسوس کیا جو پکار پکار کر کہتا ہے ”میں ان داتا ہوں، مجھ سے کچھ مانگو۔“

معاملہ بڑی پاشا کے دربار میں گیا۔ وہ بولیں۔ ٹھیک ہے ابھی تو دہن پاشا کی زچگی کیا معلوم کتب ہوئے۔ جب دودھ کا زور ہو چکا تو بچے کا منہ لگا دیو۔ وہ سارا ہفتہ زینب نے جنت یا جنت سے بڑھ کر اعلیٰ، حسین اور خواب آگیاں ماحول میں گزارا۔ ایسی غذا جو شانڈ بے حد نیک روحوں کو جنت میں عطا کی جاتی ہوگی، کام نہ دھام، ننھا ننھا سا گول مٹول بیٹا پہلو میں۔ دو پاکیزہ نہریں اپنی شدت سے جاری ہو گئیں۔ زینب کا جی چاہتا کہ اپنے بیٹے کو لے کر۔ کہیں دور بھاگ نکلے، اس طرح کہ کوئی نہ دیکھے، کوئی پیچھا نہ کرے۔ بس وہ ہوا اور اس کی مامتا کا پھول۔ لیکن مستقبل اپنا بھیا تک منہ پھاڑے اکھڑا

ہوتا — غریب باپ جو آنہ دو آنہ روز پر کانگر (جولہے) کا کام کرتے — بوڑھی ماں جو اکثر روزے رکھ رکھ کر فاقوں کی تہمت مٹاتی — کس قدر خوش تھے کہ ان کی بٹیا کو تو اللہ نے عیش کر دئے اور پانچ روپے ملانہ ان کی اپنی گزراوت کے لئے بھی مقرر کر دیا — بھلے سے وہ اپنے گھر علی بھی جائے مگر آبا کی نہ کے برابر آمدنی کیا سکھائے پائے گی۔ ۹۔

نوکری وہ کرنے سے رہی — آبا اماں نے کبھی اس بارے میں سوچا بھی نہیں اور پھر نیچے والی کو ماگیری پر رکھتے لوگ کتنا بدکتے ہیں۔ ہر طرف اندھیر ہے۔ وہ ساری فکروں سے نجات پانے کے لئے اپنے لال کو کلیجے سے لگا لیتی آٹھویں دن ڈیوڑھی میں وہ سنگامہ بپا ہوا کہ سب اپنا آبا بھول گئے — لیڈی ڈاکٹر کی اس نقار خانے میں تھلا کون سنتا؟ ڈھول تاشے، گاجے، باسے، ڈومبیاں، میراثنیاں، زچکیوں کے گیت۔ جاپوں کے گیت، خیر خیرات پکوان تلن، ایک شادی کی دھوم دھام تھی۔ بڑے سرکار اور بڑی پاشا کی خوشی کا اندازہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں پوتے سے نواز دیا تھا۔ اس دن پہلی بار زینب نے چھوٹے سرکار اور دہن پاشا کو دیکھا — چاند سورج کی جگہ گاتی جھڑی — ڈیوڑھی میں چھوٹے سرکار کے بارے میں متناور لٹے تھیں — چند چھوکریاں کہتی تھیں ”دہن پاشا کے دیول نے ہیں انوں۔“ اور چند بتاتی تھیں ”سب دکھا فاسے۔ جب موقع ملے تاک جہانک کریتیں۔“ مگر جس والہانہ انداز سے اپنی بیگم پر جھکے ایک ساتھ بیٹھے اور بیوی کو دیکھ رہے تھے اس انداز نے زینب کے دل سے ہر غم و غم دور کر دیا۔

رات گئے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی زینب جب دہن پاشا کی خبر

لیتے ان کے محل میں پہنچی تو انھوں نے بڑے دوستانہ انداز میں اس سے شکایت کی : ”اب تم ہمارا بابا چھین لیں گے نا انا ؟“

زینب پر سے، اس کے دل پر سے اس کے ہوش و حواس پر۔ سے کئی آنڈھیاں سنسنائی گزر گئیں۔ کتنی ہی دیروہ یوں ہی کھڑی رہی پھر اپنی ساری قوت گویائی جمع کر کے بولی : ”خدا آپ کا سہاگ، آپ کی ماما سلامت رکھے بی بی، میں ایسا سوچوں بھی تو جل جاؤں۔“ وہ رونے پر آگئی۔
 ”اچھو دوست انا۔ نیئیں تو بابا کا دودھ سوکھ جائیں گا۔“ دہن پاشا بے میں ماما بھر کر بولیں۔

زینب نے سر اٹھا کر پوچھا ”کس نے کس کا بچہ چھینا ہے بی بی۔“ سوچ کر جواب دیجئے گا۔۔۔“ مگر یہ بات اس نے کہی کب تھی اس کی زبان تو خاموش تھی۔

پھوٹے پاشا جو چاند پاشا کے نام سے پکارے گئے۔ جب چوبیس گھنٹے گھنٹے کے ہو گئے تو دودھ سے لگاؤٹے گئے۔ انا کا بچہ جو دس دن میں ماں کے دودھ کا عادی ہو گیا تھا۔ کسی طرح دودھ چوسنی یا نیل کو منہ نہ لگاتا تھا۔ چاند پاشا چسر چسر دودھ پی رہے تھے اور انا بار بار پلٹ پلٹ کر دیکھتی کہ اس بچے کی آواز سے میرے کان بہرے ہو گئے ہوتے تو اچھا تھا۔ پرے صحن سے بڑی پاشا کی محبت سے بو جھل آواز آئی ”اگے انا تمہارے بچے کو کسی چھو کری کے پاس دے دو یا ورجی خانے میں بھیجا دیو جی۔ چاند پاشا کو چھین سے دودھ پلاؤ۔ نیئیں تو اس کے رونے کی آواز سن سن کر تمہارا دودھ سوکھ جائیں گا۔“
 متواتر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے اور گولیاں کھانے سے بھی لیڈی ڈاکٹر

کو پھر بلوایا گیا۔

لیڈی ڈاکٹر نے خوشامد بھری جھاڑ پلائی۔ بی بی ہم تم کو گرم پانی کی بوتل سے سینکائی کرنے کو بولا۔ یہ ٹھنڈا پانی کی پٹیاں کون رکھا۔؟“
دہن پاشا کا چہرہ درد ضبط کرنے سے واقعی کھنچا کھنچا سا تھا۔ جھٹکا کر بولیں۔“ معلوم نہیں ڈاکٹر یہ لوگاں کیا کیا کر لے رہیں۔ آپ پلیر۔ میرے کو انجکشن دیو یا کچھ بھی مگر میری تکلیف کم کر دیو۔“
”مگر بی بی۔“ ڈاکٹر پیار سے بولی۔ ”تھوڑا دن بابا کو دودھ، پلانے میں کیا حرج ہے۔؟“

انگریز گورنس سے پڑھی ہوئی تبے بی بہت دلاسے ٹھنک کر بولیں
اوہ نوڈاکٹر سارا فیکر خراب ہو جاتا۔ میں نہیں فیڈ کرتا۔“

انا پر ایک خادمہ مامور کی گئی، جس کا کام صرف یہ تھا کہ کڑی نگرانی کرتی رہے کہ انا کہیں اپنے بچے کو دودھ نہ پلاؤں۔ انا کا بچہ جب بہت بلبلا بلبلا کر رہتا تو اس کے منہ میں چوسنی دے دی جاتی جسے چوستے چوستے اس کے جبرے پچک گئے۔ ڈبے کا دودھ کبھی اسے ہضم ہوتا کبھی نہ ہوتا۔ گول مٹول بچہ ہڈیوں کی مالا ہو کر رہ گیا۔ دن رات نوکر خانے سے اس کے روتے کی آواز آتی رہتی اور انا کی اپنی گود میں، اور کبھی مسہری میں بڑی پاشا کا پوتا گہری نیند سوتا رہتا۔ ایسی نیند جو پیٹ بھر کھائے بعد ہی آتی ہے۔

رات گئے جب سب گہری نیند میں ہوتے تو انا چپکے سے اپنے بچے کو اٹھا لاتی۔ اسے بھینچ بھینچ کر پیار کرتی۔ سینے سے لگاتی۔ مگر وہ جس کا سلسلہ

آل سول، خاندان سادات سے ملتا تھا۔ کبھی یہ سوچ تک نہ سکی کہ اپنے ہی گوشت پوست کے ٹکڑے کو، اپنے ہی بچے کو ایک ذرا سا اپنا دودھ پلا دے۔ نہ کہ حرامی کے بارے میں وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ کیونکہ اسے تو زندگی بھر اسی ڈیوڑھی کے آقاؤں کا نمک کھانا تھا۔ بڑی پاشا اس کا مستقبل محفوظ کر چکی تھیں۔ وہ اسے اطمینان دلا چکی تھیں کہ ایک بار جو اس ڈیوڑھی میں آگیا سو آگیا۔ بچے کا دودھ چھڑانے کے بعد بھی اتنا دل کو برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ اس ڈیوڑھی کے آقاؤں کی شان کے خلاف تھا۔ وہ جن کی ڈیوڑھی کے دروازے اتنے اونچے تھے کہ ایک کے اوپر ایک کر کے تین اونٹ کھڑے کر دیئے جاتے تو بھی آسانی سے پھانک سے گزر جاتے، وہ کیسے اتنی چھوٹی سی بات سوچ سکتے تھے کہ اپنا کام نکل جانے کے بعد کسی کو دھتکار دیا جاوے؟ ہر مہینے ایک ڈاکٹر سب نوکروں کے معاشنے کے لئے آتا تھا۔ اس بار آیا تو اس نے اتنا کے بچے کو دیکھ کر سخت تشویش کا اظہار کیا۔ دیوان صاحب سے کہنے لگا۔ ”اس بچے کی حالت اچھا نہیں ہے۔“

بچے کے ہاتھ پاؤں سوکھ گئے تھے۔ پیٹ نکل آیا تھا۔ انسان کا بچہ تھا مگر کچھ عجیب مکوڑے کا سا ڈول ہو گیا تھا۔ بڑی پاشا تک یہ خبر گئی تو وہ ہونا کر بولیں۔ ”اگے ڈاکٹر سے بولو، اس کا اچھا علاج کر دیکھی مر مرا گیا تو غم کے بارے اتنا کا دودھ سوکھ جائیں گا۔ اور چاند پاشا کی صحت خراب ہو جائیں گی۔ مگر ڈاکٹر نے کہہ دیا۔ ”بہت دیر ہو چکی ہے اس کے سوکھے کا مرج لا علاج ہو چکا ہے۔ ماں کا دودھ ملے تو شاید کچھ ہو سکے۔“

کسی دوسری عورت کا دودھ اسے دینے کی کوشش کی گئی تو اس نے

منہ تک نہ لگایا۔ اس لئے کہ ان سارے مہینوں میں عورت کے نرم گرم اور زندگی بخش سینے کی پہچان تک سے محروم ہو گیا تھا۔

ادھر ادھر ہاتھ مار کر اس نے اپنی چوسنی تلاش کی اور منہ سے لگالی۔ ڈاکٹر کے معائنے کے ٹھیک ساتویں دن، دوپہر کے ۱۲ بجے اتنا کا بچہ اپنے لیٹر میں مرا ہوا پایا گیا۔ بڑی دیر سے وہ خاموش تھا، در نہ اس کی ریں ریں جاری ہی رہتی تھی خادمہ نے ڈبے کے دودھ سے بھری کشتی اس کے ہنہ سے لگانی چاہی تو اسے اکڑا پڑا پایا۔

”اتا۔ اتا۔“ خادمہ زینب کے پاس پہنچ کر بے حد گھبراٹی ہوئی آواز سے دھیرے سے بولی، ”تمہارا بچہ۔“

”کیا ہوا میرے بچے کو؟ زینب نے بے تابی سے پوچھا۔“

وہ رُک کر جھجک کر بولی، ”شائد مر گیا۔“

زینب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ نہ روئی نہ سسکی۔

جب اتنا کا دوپہر کا کھانا لگا۔ اس وقت تک پوری ڈیوڑھی میں

اتا کے بچے کی موت کی خبر پھیل چکی تھی۔ کھانا لگنے کی اطلاع سن کر سب معمول

بڑی سرکار نے آکر دسترخوان کا معائنہ کیا۔ مرنے، بکرے کا شور بہ، روغنی رُٹی

قورمہ، پانی کے بجائے دودھ سب ٹھیک تھا۔ وہ دونوں ہر چیز کا جائزہ لیتی

تھیں کہ ایسا نہ ہو کھانے میں کمی رہ جائے اور چاند پاشا کے دودھ پر اس کا برا

اثر پڑے۔ دسترخوان کا جائزہ لے کر انھوں نے دوز کی طرح آواز دی۔ ”اتا

چلو کھانا کھا لیں، پھر بچے کو بھی دودھ پانا بہت۔“ زینب ایک معمول کی طرح اکٹھی،

ہاتھ دھوئے اور دسترخوان کے کنارے بیٹھ کر مقوی کھانا کھانے لگی۔ کہ بچے کا

دودھ نہ سوکھ جائے۔

نو لکھا مار

”پچھلی رات کو رت جگا“ تھا اور اب اسی لئے سارے میں سوتا پڑا ہوا تھا
 بیبیاں باندیاں سب پاؤں پسارے، کھلے ڈھکے سے بے خبر ساں ساں سوئی
 پڑی تھیں۔ بس ایک دلہن پاشا کی آنکھیں تھیں کہ نیند سے دشمنی مول لئے بیٹھی تھیں
 بچے دالان میں چھالیہ کرتی کوئی بی بی نوکرا نیوں پر چلائیں۔ اگے پھنالاں۔
 کب تک سوئیں گیاں۔ رات کو مہندی سانچے آنے والی ہے کہ نہیں۔ دوپہر،
 والوں کے استنبال کی کوئی فکریچ نہیں مال زادیوں کو۔“ اور وہ کھٹا کھٹ
 سردتا چلانے لگیں۔

سوئے والیوں میں ذرا بھی تپ پھل پیدا نہ ہوئی دلہن پاشا نے نرم سی آواز
 میں پوچھا۔ ”مغلانی اماں، بی بی تارا کے دوپٹوں پوچکا تو ٹٹک گیانا؟“

”وہ تو ٹنک گیا پاشا، پن یہ پوٹیاں اٹھیں گے تو ہو رہی ہزار کماں کرنے کو پڑے، سودہ تو مر کو گیاں۔“ وہ ذرا رک کر بولیں۔ ”پن پاشا آپ تو ذرہ بھی نیند نہیں لے لے ایسے سے صحت خراب ہو جائیں گی۔ آپ جا کو ذرا تو آرام کر لیں۔“

دلہن پاشا چپ ہی رہیں تو مغلانی اماں ذرا دکھ بھرے لمبے میں بولیں۔ ”ہو ماں۔ بیٹی بیاہنا بھی کوئی معمولی کام تو ہے نہیں۔ اُجاڑول کیسا بھاری ہو جاتا کی پہاڑ بن جاتا۔ بیاہے سو مصیبت، نینٹ بیاہے سو مصیبت۔“

دلہن پاشا اک کرب ناک سی سنسی نہیں۔ ”نینٹ مغلانی اماں میری صحت کو کچھ بھی نہیں ہونے والا۔ میں اچھا خاصا تو سوئی۔ پوری نیند لے کو اُٹھی ہوں۔“

پوری نیند۔؟ اس سفید جھوٹ پر انھیں خود سنسی آگئی۔ ان کی نیند تو آج سے نہیں اس گھڑی سے ہی ان سے روٹھ گئی تھی جس رات وہ بیاہ کر اس وسیع و خلیف جوتلی میں آئی تھیں۔ کیسی جگمگاتی رات تھی وہ بھی، یہاں سے وہاں تک چراغاں ہی چراغاں۔ پہلی بیٹی اور اکلوتی بیٹی۔ بیٹے تو تین تین تھے۔ اصل ارمان اور کھٹاٹ ہاٹ تو بیٹی ہی کی شادی میں آبا خُصُور کو نکلنے تھے۔ رات کو دن بنتے تو بہتوں کی شادیوں میں دیکھا ہو گا۔ مگر دلہن پاشا کی شادی میں رات جو دن بنی تو کئی ہفتے تک دن ہی دن بنی رہی۔ نہ پہنر کا کوئی حساب تھا نہ اوپری دین لین کا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ ایک بیٹی کی شادی میں بڑے نواب نے اتنا اکٹھایا کہ حیدر آباد کی ساری بیٹیوں کی شادی کی جاسکتی تھی۔ اور داماد بھی کیا جن کر ڈھونڈا تھا کہ دیکھو تو بولیں دیکھتے رہ جاؤ۔ سر پرستار کلاہ، جاے دار کی چم چاتی شیردانی اور رول دار اطلس کا جھم جھماتا پنڈلیوں

پر کسا ہوا پا جامہ پہنے، سر سے ٹخنوں تک جھولتا سہرا باندھے جب وہ دلہن کو گود میں اٹھانے آئے ہیں تو ساری محفل ہتکا بتکارہ گئی، جیسے کسی کلی کو اٹھا ہے ہوں، ایسی ہی آسانی سے انہوں نے دلہن پاشا کو گود میں اٹھالیا۔ کسی میراثی نے پتے کی بات سنائی "اے بی، مرد اور پان تو کراہے ہی اچھے لگتے ہیں۔ دیکھو تو کیا مزے سے کوٹے میں بھر لیا۔"

مگر وہ ایک ہی رات کی بات تھی جب ددہا میاں نے اپنی نئی نوٹلی دلہن کو کوٹے میں بھرا ہوگا۔ نصیبوں کا حال ادھر اے کو معلوم، دلہن پاشا کہ جن کا اصل نام اشرفی بانو تھا۔ اشرفی یوں کہلا بیٹیں کہ بچپن میں سونے کی طرح دمکتی تھیں، پیاسے ماں باپ نے، اشرفی اشرفی پکارا تو نام ہی اشرفی پڑ گیا۔ جوانی آئی تو کنڈن بن بیٹھیں۔ سنہرا سہرا رنگ، حیدر آباد کی عام لڑکیوں کی طرح، بلکہ اس سے بھی سوا بجے گھنیرے بال۔ جھلمل کوڑوں کی طرح بادامی آنکھیں۔ بھلے کو کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا کہ حویلی کی ریت ہی یہ تھی کہ لڑکیاں نگاہیں نیچی رکھیں ورنہ جس طرف نظر اٹھتی کشتوں کے پشتے لگ جاتے اور اوپر سے قوسوں اور چراغوں کی رعنائیاں کیا قیامت تھی کہ ہے! پھر حویلی کا ایک جان لیوا چلن یہ تھا کہ لڑکیاں ان دنوں اندر کرتوں کے اندر محرم و حرم کچھ بھی نہیں پہنا کرتی تھیں۔ جو ہے بس سامنے ہی ہے۔ ایسی آنچیں دیتی جوانی کہ سردیوں کی ایک رات لڑکیوں کو یاد ہی رہ گئی۔ جب مار سردی پڑ رہی تھی اور نوکر خانے سے گل بدن نے انگلیٹھی لانے میں دیر کر دی تو سب لڑکیوں نے ایک زبان ہو کر کہا تھا۔ "الذباب سردی کا کیا رہنمائی ہے جی۔ اے اشرفی کی طرف ہاتھال کر کو آگ تاپ یو۔ سوب لوگاں گرم ہو جائیں گے۔"

ایسی انگلیٹھی بدل جوانی تھی اور شریر ہوا کہ جہیز میں پیش بندھی جو دی گئی وہ جنوب کے اضلاع کی تازہ تازہ رکھی گئی ایک مار پٹاخہ لمباٹن، یعنی بخارن چھوڑی تھی۔ ایسی تو کئی جہیز میں دی گئی یقین لیکن ہم عمری کے نلے اصل کام دھام کی خاطر وہ لمباٹن ہی اصل پیش بندھی مانی جاتی۔ اپنی تیز طرار اور چلیبی طبیعت کی وجہ سے اشرفی بانو کو وہ بہت پسند بھی تھی۔ لیکن یہ کب سے خبر تھی کہ اس کی تیزی ان کے اپنے نصیب کو ہی اس تیزی سے چاٹ جلائے گی۔

شادی کی رات — پہلی رات، سہاگ رات گزار کر جب دوہلے پاشا اپنے شہزادوں ایسے شان دار کمرے سے نکل کر جب باغ میں آئے تو دیکھا کہ خوب دھماچو کڑی شور مچ رہا ہے۔ ایک لمباٹن ہاتھ لیے کر کے مالی سے وہ پچھلے رہی ہے کہ مالی سات بچوں کا باپ ہو کر بھی نامردوں کا سردار نظر آ رہا ہے۔

”لے چھو کری، اتنا شور کیوں مچا رہی ہے۔“
 دوہلے پاشا نے اسے مخاطب کیا۔ جس کی ان کی طرف پیٹھ تھی۔
 ”لے چھو کری“ سنتے ہی اس نے تنک کر سر گھمایا اور اس کے سر گھماتے ہی ادھر دوہلے پاشا خود گھوم کر رہ گئے۔ ایسی آفت ڈھاتی جوانی تو ان کے ہاں بھی اپنے خوابوں میں نہ دیکھی ہوگی۔ چہرہ تھا کہ انگارہ بنا ہوا تھا۔ آنکھیں آگ برساتی ہوئی۔ اتنی موٹی چوٹی تھیک سینے کے زچ میں چاندی کے ٹٹوں کے ادھر پڑی ہوئی اور چوٹی کے ایک طرف ادھر اور ایک طرف ادھر۔ بس اب کیا کہا جاوے.... بڑے غصے سے اس نے کہا ”میں چھو کری دیکھتی ہوں۔؟“

اب دوہلے پاشا کی مردانگی بھی خوشی خوشی جاگ پڑی۔ ذرا شرارت

بولے۔ ”دکھتی تو چھو کری ہی ہے۔ مرد لوگاں ایسے پہاڑیاں اٹھا کر نہیں گھوما کرتے
انہوں نے صاف اس کی جوانی پر چوٹ کی،

”میرے کو میرے نام سے پکارنا سرکار، ہاں بول دی میں!“
”مگر آپ کا اسم شریعت؟“ دوہلے پاشا ہنسی روک کر بولے۔
”بگیا“ اس نے اسی بے اعتنائی سے جواب دیا۔

’بگیا۔ بہت اچھے۔ وانجی پھولاں ہی پھولاں ہیں یہاں سے وہاں تک‘
پھولوں کے ذکر پر بے چارہ مالی شامت اعمال سے دخل انداز ہو گیا۔ ”دیکھئے
سرکار میں یہی اچ بول راتھا کی یہاں سے وہاں تک پھولاں ہی پھولاں ہیں۔ ہور
آپ کا حکم ہے کی پھولاں توڑا نہیں کرو۔ اپنے آپ سے مر جھا کو، ٹوٹ کو گر گئے
تو گرنے دیو۔ پن یہ کیا بولتی کی میں اپنی بی بی صاب کے واسطے قہر دل گچ توڑ دو
گی۔ ہور کیا بولتی“

ایک دم اس قیامت نے حقارت آئینز لہجے میں دھنکارا،۔ ”اگے
تو جاکو اپنی بی بی کے پہنگے میں سو جانا اے۔ چپ کا چپ ٹر ٹر لگا کر رکھنا۔
جاجا، بہوت دیکھے تیرے جیسے پھولاں سنبھالنے والے۔“

پھولاں سنبھالنے والے تو ہم ہیں بگیا بیگم، دوہلے پاشا کے دل سے آواز نکلی
اللہ معلوم اس بگیا میں کیا زہر بھرا تھا کہ آپ تو ویسے ہی بھری بھری کسی
کسی رہی، مگر دوہلے پاشا کو چوس چوس کر چوک بنا ڈالا۔ کسی کام کے نہ رہ گئے۔
یا تو وہ ایسے کرار سے تھے کہ پہلی رات کو دہن کو کلی سمجھ کر اٹھالیا تھا یا اب پانی کا
گلاس بھی اٹھاتے تو ہاتھ مقرر تھر کاٹنے لگتا۔

دہن پاشا کے حصے میں کیا آیا۔ بس بھڑکتی، انگارے بھاتی جوانی۔

اور شادی کی اکلوتی ایک رات کی یادگار، ایک بچی — پھر میاں نے انھیں کبھی بھولے
 بسرے بھی ہاتھ تک نہ لگایا۔ یوں ہاتھ لگانے یوگہ بھی کہاں گئے تھے۔ دہن پاشا
 چودہ برس کی بیاہی سسرال آئیں۔ نویں مہینے ایک گڑیا سی بچی کی ماں بن گئیں
 پندرہ برس کی ننھی سنی ماں، اپنی ہی بچی سے یوں کھیلتیں جیسے ماں باپ کی
 سب سے بڑی اولاد اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیلے۔ کھاتے پیتے
 گھرانے کے بچے تو ویسے ہی جلد ہی جوانی کی جوانی کی منزلوں کو جا چھوتے ہیں۔
 پھر دہن پاشا کی تو ساری زندگی ہی ان کی اپنی بیٹیاں بی بی تارا تھی۔ اس کو بنانا
 سنوارنا سجانا، اپنے ہاتھوں کھلانا پلانا، اماڈوں اور نوکرائیوں کی پلٹن ہونے
 کے باوجود اس کا ہر کام اپنے ہاتھوں کرنا۔ ہر دم ان کا ہی تو مشغلہ تھا۔

بی بی تارا کچھ ہی عرصے میں ماں کی بہن لگنے لگیں۔ دس گیارہ برس کی ہونے
 کے بعد تودہ ماں کے جہیز کے کپڑے بھی پہننے لگیں۔ کیوں کہ ہاتھ پیر خوب نکل
 آئے تھے اس قدر کم فرق ماں بیٹی میں نظر آتا کہ دادی حضور نے شروع ہی سے
 ماں کو بجائے امی حضور کے آپا کہنا سکھایا تھا۔ اب برسات کے دنوں میں کبھی
 جھولے پڑتے تو بی بی تارا ماں کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی آنگن میں لے جاتیں۔ جھولے
 پر بٹھا دیتیں۔ ہاتھوں میں ہاتھ دے کر نپھکڑی کھیلتیں۔ آگے پیچھے بھاگ کر
 آنکھ مچولی، چھینا بانی، لپا چھپی کھیلتیں، دیکھنے والے کہتے: ادلی، ایسا لگتا
 جیسا دونوں بہناں بہناں۔ اور ادھر چند برس سے تو بی بی تارا باقاعدہ بڑی بہن
 لگتی اور ماں چھوٹی بہن،

بی بی تارا کو گھر کے کام کاج سکھائے گئے، اسکول میں پڑھایا گیا۔ نوابوں
 کی عدت تک جتنے بھی سینے پر رونے، مہمان داری، اور گھر بیچ زندگی کے کام کاج

ہوتے ہیں۔ وہ تو نوکرائیاں بیٹھ لیتیں ہیں، مگر بی بی تارا نے اپنے اٹھڑپن کے باوجود دوستی دوستی میں بہت کچھ سیکھ ہی لیا۔ سولہ برس کی شہد شکیلی عمر میں جب پیغام اس لئے ٹوٹ ٹوٹ بڑھنے لگے، کہ اکلوتی ایک بیٹا کو تو نواب دولت یار جنگ ایک زمانہ سمیٹ کر دے دیں گے۔ تو دہن پاشا کا دل دھڑکے ہو کر رہ گیا۔ میری گڑیا مجھ سے بچن جاوے گی، میرا کھلونا مجھ سے بچھڑ جائے گا۔ نیند تو مقدر میں تھی ہی نہیں اب تو بالکل اکھڑ کر رہ گئی۔

شادی کی رات تھی، اور یہ دن — ایسی غیرت مند بی بی تھیں کہ پھر کبھی تو شوہر سے پہل کر کے بات نہ کی، بستر کے قابل تو رہی ہی نہیں تھیں۔ بات چیت بھی اگر وہ کر لیتے تو بس جواب دے دیتیں۔ یہ کبھی نہ ہوا کہ اپنی طرف سے اٹھوٹے بات میں پہل کی ہو۔ لیکن غموں کا مار کھایا ہوا۔ ماں کا ترپتا دل لے کر وہ اس دن پہلی بار سان کے پاس گئیں اور کہا: آپ باپ ہیں۔ جو بھی کریں گے میرے کو منظور ہے۔ مگر خدا کا واسطہ دیتوں کی بی بی تارا کو گھر داماد دیو۔

”گھر داماد مل جائیں گا۔؟“ نواب صاحب ذرا شک سے لہجے میں بولے۔
 ”کیوں نہیں ملیں گا۔ آپ اتنی بے حساب دولت دیں گے تو کوئی بھی گھر دامادی قبول کر لے سکتا۔“ وہ ایک دم رو پڑیں۔ ”میں اب پرانی باتاں، نکالنا نہیں چاہتی، اگر اچکچ بات بولتیوں کی میں اپنی پتی کے بغیر زندہ نہیں رہ، سکوں گی۔“

شانہ زنا کی بھر کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا بس ایک آسان ذریعہ،
 نواب صاحب کو نظر آیا۔ محبت سے کہنے لگے: ”تم جو چاہتے ہو، جیسا بولتے
 ویسا ہی انشاء اللہ ہو جائیں گے۔“

بی بی تارا مایوں بیٹھی تھی۔ ہر طرف شادی کے ہنگاموں کی دھوم تھی۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یہاں سے لے کر دہلی تک ایک طوفان سا پھیلا ہوا تھا اب دلہن پاشا کی میند کاہنے سے اڑ گئی تھی۔ بیٹی گھر کی گھر ہی میں توہنسنے والی تھی نا۔ اب تو یہ ساری ٹھیل یوں مچی ہوئی تھی کہ بچپنی رات کو جورت جگا ہوا تھا اس نے ان کی سوئی ہوئی جوانی کو دسکے مار مار کر پھر جگا دیا تھا۔

رات کو وہ تو اپنے کمرے میں ہی تھیں، مگر خاندان بھر کی بیاہی، آن بیاہی لڑکیاں، عورتیں، خواہمیں، ماما میں، نوکرانیاں، دالان میں ہلڑ بازی مچا۔ ٹے ہوئے تھیں۔ شاہ آبادی پتھروں والے فرش پر سے جاجم اور چاندنی اٹھا کر وہیں انگلیٹھیاں اور چوہے جلا دیئے گئے تھے۔ اور دھن دھن پکوان پکے تھے۔ گنگلے چنگے، سیوے کی پوریاں، لمبیدے،۔ ایک طوفان تھا۔ یہ سارا پکوان شادی کے گھر میں آئے ہوئے مہمانوں کے ساتھ توشے کے طور پر دیا جاتا تھا۔ اس وقت پکوان ہوہے تھے اور مذاق کے مذاق۔ ادھر میرا نہیں کیا کسی سے کم تھیں۔ ایک سے ایک بخش کھانے گلے جارہے تھے۔

اُجاڑ مارا گلا ترخ گیا گاتے گاتے۔ ایک میرا شن تنک کر بولی۔ "اب میری جگہ کسی اور کو لے دو۔ اور میرے کو ذرا آرام دیو۔"

"اچھا چلو۔" ایک کنیز شرارت سے بولی۔ اب ذرا پہیلیاں بوجھیں گے۔"

"اچھا تو بول میں بوجھتیوں۔" دوسری بولی

ایک خالہ زاد بولیں۔ "اچھا جو پہیلی بوجھو کو نہ دے وہ میری باند بنے" تیسری بولی۔ برابر بھگ کو دیتی ہیں۔ میرے کو بہت مسئلے اور پہیلیاں

یاد نہیں۔“

”اچھا تو شروع — بسم اللہ۔“

”ایک کھال موتیوں سے بھرا

سب کے سر پہ اوندھا دھرا

چاروں اوندہ کھال پھرے

موتی اس سے ایک نہ گرے

سب چلنے لگیں۔ ”ایو اللہ، اتا آسان، یہ تو آسمان اور تارے ہیں

”برابر — اچھا اب دوسرا بوتلیوں — ذرا غور سے سننا۔“ ایک سہنس

کر بولی۔

چٹاخ پٹاخ کب سے ہاتھ پکڑا جب سے

آہ ادنیٰ کب سے آدھا گیا جب سے

چپ چاپ کب سے سارا گیا جب سے

اک دم ہنسی کے ٹھٹھے اُبلنے لگے، اور پھیلی بولنے والی گویا

پڑنے لگیں۔ مگر وہ تنک کر کہنے لگی، ”اگے تمہارے دماغاں گندے ہیں اُجاڑ

مارو۔ یہ تو امیر خسرو کی پھیلی ہے۔ اس کا جواب ہے کنگن : اب سوچو کھلا

”اچھا ایک ہور بوجھو :“

بات کی بات ٹھٹھولی کی ٹھٹھولی

مرد کی گانٹھ عورت نے کھولی

بی بی تارا، جو سہیلیوں کے بیچ میں ہنستی مسکراتی، شرمائی بجائی بیٹھی

تھی، دھیرے سے بولی : ”تفل چابی۔“

دو ایک لڑکیوں نے اس کے دھوکے جڑے۔ ”بڑی چتری ہے وہ تو تو میں بھی سمجھ گئی تھی۔“

”اچھا ایک پھیلی بولتیوں اب، ایک طرارسی نوکرائی نے کہا۔“ جو یہ پھیلی نہیں بوجھا، اُس نے میرا نوکرت

”ہاں، بول بول، سب لڑکیاں چلائیں۔“

”سوتے سوتے ہاتھ میں لے کر سوتے۔“

”حرام نادہی — تیرا دماغ تو بالکل لپچ دلیا ہے۔“

دہی نوکرائی ہنس کر بولی ”اچھا ایک ہور بولتیوں ۷ دونوں کا ایک اپج جواب ہے۔ سوچ کو بولو۔“

”اسلتا مسلتا، ہاتھ میں لیو تو پھسل پھسل پڑتا۔“

پھر بی بی تارا ہی بولی : ”نکھا — دونوں کا جواب نکھا اپج ہے۔“

اب سب نے سوچنا شروع کیا : ”اے سچی تو بات ہے۔ سوتے وقت ہاتھ

میں نکھالے کر سوتے نا گرمی کے دنوں میں — ہور ہاتھ میں پسینہ آتا تو اُجاڑ مارا

پھسل پھسل بھی تو پڑتا نا۔“

”اب میری پھیلی جو نہیں بوجھے تو اس کو میرے سامنے سواٹھک بیٹھک

کرنا پڑے گا۔“ حویلی کی مغلانی اماں کی بیاہی بیٹی نے کہا۔

”ہاں بولو۔“

”اردڑوں مردڑوں، تھوک لگا کر اندر گھسیڑوں۔“

سب گالوں پر ہاتھ ٹکا ٹکا کر سوچنے لگیں اتنے میں ایک لڑکی بھاگی ہوئی

گئی اور ہاتھ میں کچھ لٹے لٹاپس آئی۔ زور سے چلا کر اس نے اعلان کیا ”سوئی ادھگٹا“

سب اس کی جان پر ٹوٹ پڑیں۔ اگے دیکھو، یہ سب یہاں نیٹ چلنے والا۔ کتاب میں سے دیکھو دیکھو کومت بولو۔

لڑکی نے دونوں ہاتھ میں کتاب دہرائی :- اچھا سچی بولتیوں، اب سے ٹھٹھا کھیل نیٹیں۔ دل سے یوں سب لوگ۔ میں بھی۔

”اگے دلہن بیگم، تم نا بھی تو کچھ مونہہ کھولو۔“

دو چار سہیلیاں بی بی تارا کو خوب گدگدائے لگیں۔

وہ ہل کھا کر ہانپ کر بولیں۔ ابا، خٹکے واسطے اتنا گدگدی مت کرو۔

مرجا ڈل گئی۔ اچھا، بس ایسے بول کے میری باری ختم۔ آں۔“

پھر وہ ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرا مسکرا کر بولنے لگی۔

”تو جاتا تھا میں پکارتی تھی“

”تو ڈالتا میں روتی تھی“

پھر تو دیکھتا تھا، میں منستی تھی۔“

ایک دم طوفان کی طرح چکراتی، بلبلائی، آگ برساتی، دلہن پاشا اپنے کمرے سے برآمد ہوئیں۔ یہ کیا فضول باتاں لگائے بیٹھے تم لوگاں۔ کچھ غفل ہے کہ نیش کہانے بیٹھنے والیاں میں کنواری بچیاں بھی ہیں۔“

بی بی تارا اپنی جگہ سہم سی گئی۔ ”آپا، ہم تو خالی چوڑیاں اور چوڑی ملالے کا مسئلہ بولے۔“

دوسری ڈکر اپنے ہاتھوں میں چھپائی ہوئی کتاب آگے بڑھا کر کہنے لگی۔

”دیکھو بیٹے یہ تو ہم کتاب میں سے یاد کرے۔“

دلہن پاشا نے اٹھل پھٹل پچھل پچاتے سانس کو بڑی مشکل سے سینے میں سمیٹا

اور کتاب زور سے جھپٹ کر اپنے بستر پر آگئیں۔ کتاب کو تیزی سے کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ ”چند دھننی پہیلیاں“ کے عنوان سے الہ آباد کے کسی محمد نعیم الرحمان ایم اے نے کتاب مرتب کی تھی۔ جو اس وقت ان کے جلتے بدن پر گرم تیل بن کر ٹپک رہی تھی۔ انھوں نے چرچہ کر کے پوری کتاب پھاڑ کر رکھ دی تھی۔

پھر وہ نہ سو سکیں۔ ایک ایک کر کے پوٹے سے سولہ برس کی زندگی کے دن ان کے سامنے آ کر اپنی اپنی شکایتیں کرنے لگے۔

ایک دن بولا، یاد ہے، ایک دن برسات میں خوب پانی برس رہا تھا۔ قرب بجلیاں چمکیں تھیں۔ تم آنکھ میں اُتری تھیں تو پورا لباس پاؤں میں بھیگ کر سارے آگ ایسے بدن سے چپک گیا تھا۔ تمہیں کتنی سردی لگ رہی تھی یا رہے نا۔! ایسی سردی کیا کبیلوں اور غمخیزانِ رضا یثوں سے جاتی ہے؟“

ایک اور دن نے کہا ”نواب دولت یار جنگ نے تو ایک رات کے بعد کبھی اس انجیٹی ایسے جسم کو چھوا تک نہیں پھر تم نے اپنے آپ پر یہ ظلم کیوں روا رکھا کہ حویلی میں کتنے لڑکے تمہاری ایک چشم کرم کے منتظر ہوتے تھے۔ مگر تم نے انہیں پوچھا تک نہیں۔ یاد ہے ایک دن غولت نواب نے تمہارے دوپٹے کا، آنچل اک ذرا اتھام لیا تھا تو تم نے کتنی زور سے ان کے کھپڑ مارا تھا۔ کیا جنت میں جلنے کی آرزو اتنی شدید ہے؟“

ایک اور دن بولا۔ ”ایک موٹر زندگی بھر اسی لئے وقف رہی کہ منوں برف کی سلیں لائے اور تم ٹب میں وہ برف گھول گھول کر ترخ بستہ پانی سے نہانہا کر اپنے جسم کی تپش ٹھنڈی کرتی رہو۔ مگر کیا یہ وجہ کی گرمی برف سے سمجھ جاتی ہے؟“

یاد ہے ایک دن.....“

ایک دن !

ایک دن !!

ایک دن !!!

انہوں نے اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھ لئے۔ کتنے دنوں کو یاد کر دوں اور کتنے دنوں کو بھولوں۔ اب میں اپنی بیٹی دداع کر رہی ہوں، میں اکتیس بتیس کی ہی دیکھنے میں حیران ہی۔ میرے ارماناں پیاسے ہی۔ میرے آرزواں تشنہ ہی پر میں اب سب بھول جاتا چاہتی۔ میں اپنی بیٹی کی بڑی بہن دکھتی۔ یہ بھی صحیح ہے کوئی بھی ہم دونوں کو آج تک ماں بیٹی نہیں بولا۔ جو بولا بہناں، بہناں اچ بولا۔ پھر بھی میں اب ایک داماد کی ساس بننے جا رہی۔ انہوں نے چرخ کران دیکھی تو توں کو جیسے بھگنے کی کوشش کی۔ !

”چلے جاؤ میرے سامنے سے نکل جاؤ۔ یہ پلید خیالاں دراصل شیطانی ہیں۔ مالک میرے کو آج تک سمجھالا، اب بھی سمجھالے۔“

ادردہ ہانپتی، ہانپتی کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

رات بگے کی رات گئی۔ پھر ہندی کی رات بھی گئی۔ ساپخت کی رات بھی گئی۔ اور آج شادی کی رات، یعنی جلوسے کی رات تھی۔ حویلی میں وہ بھگدڑ مچی ہوئی تھی کہ منٹ کے کام کو خواہ مخواہ گھنٹہ لگ رہا تھا۔ بیٹی بیاہ کر میسکے ہی میں رہنے والی تھی کہونکہ گھر داماد میسر آ گیا تھا۔ داماد میں ہر خوبی موجود تھی، بس ذرا عمر کا فرق تھا، تو بھی دودھ پینے والی بھینس کی دولائیں تو کھانی ہی پڑتی ہیں۔ پڑھا لکھا ہونہار نواب خاندان کا لڑکا تھا۔ عمر چونتیس سال تھی کچھ لوگوں نے منہ بھی بناٹے۔

”نگے کوئی بات بھی بھڑائی اجاڑی نہ تھی دیکھو سو سو برس کی، اور وہ لہا دیکھو
سو پوری گنی عمر کا — ایسا کیا کال پڑا تھا کیا چھو کروں گا۔“

”اب آیا، ایک نہ ایک جگہ تو جھکنہ ہی پڑتا ناماں۔ دیکھو سب چیز تو بڑبڑ
ہے۔ بس عمری ذرا زیادہ ہے — اس سے کیا فرخ پڑ جائیں گا بھلا۔“

”فرخ کی بات تو جانتے دیو — جوڑ کو جوڑ تو بھنا چاہیے نا۔“

”وہ تو سمجھیں گا — نیٹیں تو ایک دھندلوں کے بعد عورت خال اماں نیٹیں تو پھوپھی

اماں گلنے لگ جاتی مرد کی۔ اچھا اچ ہے مرد شے نے ذرا بڑی عمر کا اچ ہونا۔“

لیکن جب رفعت نواب بڑھکھٹے کو آئے تو سب اپنی جگہ سن رہ گئے

ایسا جی دار مرد، ایسا ہانکا سمیلا جان، — کلین شیو — نڈاڑھی نہ مونچھ۔ گورا رنگ

اونچا قد، مضبوط ہاتھ پاؤں، چوڑی چکلی چھاتی۔ مسکراتا چہرہ، شریا نکھیں —

صورت سے شکل سے پچیس پچیس سال کا لڑکا، سب اپنی معقول اور نامعقول

رائیں دل ہی دل میں دبا کر بیٹھ گئے۔ واقعی اچھا جوڑ ملا تھا۔ بی بی تارا تھی تو سولہ

سال کی۔ مگر عمر اس سے کچھ زیادہ ہی لگتی۔ اور یہ زیادہ ہو کر کم لگتے۔ یوں بھی عمر

صوتوں ہی سے پرکھی جاتی ہے۔ کوئی اسکوڑوں میں سرٹیفکٹ تھوڑی ڈھونڈنے

جالتے ہیں۔

برسات جس دھوم دھڑکنے سے آئی اس کا ذکر فضول ہے۔ اس لئے کہ ادھر سے

گھر داماد، — ماں باپ نے جی کھول کر جو دیا، دو لہا والوں نے بھی کوئی کسٹر چھوڑی

اور چیزوں کو تو جلنے دو صرف ایک ہار ہی پڑے تو لاکھ کا تھا۔ اب کسی کو یقین آئے

یا نہ آئے یہ پرانے نوابوں کا دستور رہا ہے کہ ایک نہ ایک خاندانی زیور ان کے یہاں

پشت پاشت سے چلا آتا ہے۔ جو خاندان کی ہر بڑی بہو کو چڑھایا جاتا ہے —

سورفت نواب کا خاندانی نوکھا ہار تھا جو پرانے وقتوں کے نولاکھ روپے کا تھا
یقیناً اب اس کی قیمت گنی تگنی ہوگی مگر نام دی جلا آ رہا تھا۔ ”نوکھا ہار۔“

عقد خوانی ہوگئی — باہر بیڈ باجہ اور اندر ڈھولک پٹنے لگی۔ یہ گویا
اس بات کا اعلان تھا کہ نکاح خوانی ہوگئی اور بیٹی پرانی ہوگئی۔ اب اندر آ رہی مصحف
بہن جلوے کا ہنگامہ ہوتا تھا۔ جس کے بعد ہی دولہا میاں اپنی دہن پر قابض ہو
سکتے تھے۔ قاعدہ ہے کہ جلوے سے پہلے دہن کو نئے سرے سے سجایا سنوارا جاتا
ہے۔ کیونکہ ایجاب قبول کرانے کے لئے جب دیکھیں اور ماموں دہن کے پاس ہوں،
کہلوانے آتے ہیں تو دہن کچھ تو میکہ چھوڑنے کے غم میں سرخچ اور دنیا دکھاوے کو اس
سے بھی زیادہ، رہ رہ کر اپنے آپ کو ہلکان اور بد حال کر لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آ رہی
مصحف کے وقت جب زندگی میں پہلی بار آٹھنے میں دولہا میاں کو اس کا دیدار کرایا جاتا
ہے۔ اس رخ روشن کا دلکش نظر بہت ضروری ہوتا ہے جو بعد میں خینہ زندگی ہر دیکھنا ہوتا

سسرال سے آیا ہوا جوڑا بی بی تارا کو پہنایا جا چکا تھا۔ اس قدر وزنی
کنو اب کا جوڑا کہ بی بی تارا اپنے وزن سے گنی ہو گئیں، پھر زیور پھر بھر داں جوڑا،
پھر حیدر آبادی نگوں کا جوڑا، پھر ہینچیاں، پھر کرن پھول، پھر ماتھے کا جھومر، پھر
مانگ کاٹیکا۔ بس بے چاری دہن بوجھ کے بارے زمین کی طرف جھکی چلی آ رہی
تھی۔ اور بھی ایک قیامت تو باقی ہی تھی، ابھی تو دولہا میاں منہ دکھائی میں دو
نیش قیمت وزنی ”نوکھا ہار“ بھی اس کے گے میں پہنانے والے تھے۔

جلوے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ بڑے سے چاندی سونے کے بلواں چھپرکھٹ
پر جہیز میں دیا جائے والا شان دار غنمیں بستر بچھا دیا گیا، زریں مسند
زریں گاڑ کیے، گڈ گڈے لحاف — بی بی تارا کو سنبھال کر بہت سی لڑکیا

بچہ کھٹ تک لائی اور گڑیا کی طرح بٹھایا برابر میں دلہن پاشا کو بیٹھنا پڑا۔ وہ لاکھ شرمائیں لاکھ بہانے بنائے مگر بہنوں، تہذوں، بھاد جوں، نے پکڑ دھکڑا کر انہیں چھپر کھٹ پر چڑھا دیا۔ — اب موہنہ دکھائی کے جو بے حساب روپے اور زیور ملتے انہیں کون سنبھالتا پھرتا؟

دو لہاں میاں کے اتنے ہی جیسے قیامت آگئی۔ میراٹنوں نے امینڈی، ہینڈی آوازوں میں دعا کی گیت گانے شروع کر دیئے۔ جنہیں سن کر لڑکیوں بالیوں نے رونے کی بجائے ہنسنا شروع کر دیا۔ بھلا ایسے رومانٹک موقع پر کہ پہلی بار اپنی دو لہن کا چاند سا چہرہ دیکھنے کے لئے دو لہا آیا ہے۔ رونا دھونا کس کو سوجھتا ہے۔ تنگ آ کر میراٹنوں نے گانا بند کر دیا۔

دو لہا میاں کو چھپر کھٹ پر ٹھیک دو لہن کے سامنے بٹھایا گیا۔ دو لہن کے برابر میں دلہن کی ماں براجمان تھیں۔ کسی میراٹن نے پتہ نہیں کس رو میں اس ہلڑ میں ایک بات کہہ دی، جو کسی اور نے سنی نہ سنی دو لہا میاں نے ضرور سنی لی،

”ایو، دلہن پاشا کو دیکھو، انہو خود اچ دلہن لگے رہیں۔“

واما دلنے اب ذرا غور سے ساکس کو دیکھا۔ انھوں نے اپنی ساکس کو سولہ برس پہلے چاہے نہ دیکھا ہو۔ مگر تھیں تو وہی۔ — چاول بھر بھی تو نہیں بدلی تھیں سنہرا سنہرا رنگ۔ حیدر آباد کی عام لڑکیوں کی طرح، بلکہ ان سے بھی سوا بسے گھنیرے بال۔ جھلمل کٹوروں کی طرح بادامی آنکھیں۔ — اور اوپر سے قد سوں اور مخرابوں کی رعنائیاں۔ کیا قیامت تھی کہ ہے! پھر حویلی کا ایک جان یوا، چلن یہ تھا کہ لڑکیاں ان دنوں بھی اندر کرتوں کے اندر محرم و محرم کچھ بھی نہیں پہنتی تھیں۔ جو ہے بس سلتے ہی ہے۔ ایسی آنچیں دیتی جوانی کہ سردیوں کی اس شام کو بھی جب ہزاروں

لوگوں کا ہجوم تھا۔ اسی ایک انگیٹھی کی بدولت سارا ماحول گرا گرم محسوس ہو رہا تھا۔ انھوں نے بڑی شرمیلے لگا ہوں سے ساکس کو دیکھا۔ رعایت امتناع عرس کے مطابق بر دکھاٹے کو داماد آتا ہے تو سائیں پرہہ کرتی ہیں۔ اس لئے اس دن وہ اپنی ساکس کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ آج دیکھا تو بس دیکھے ہی جا رہے تھے۔ دلہن پاشلے گھبرا کر نگاہیں جھکالیں۔ حویلی کی ریت ہی یہ تھی کہ لڑکیاں نگاہیں نیچی رکھیں۔ ورنہ کشتیاں کے پشتے لگ جاتے۔

اب آئینہ لایا گیا۔ سونے کے چوکھٹے میں جڑا آئینہ جس میں پہلی بار دو بہائیاں اپنی دلہن کا منہ دیکھ کر اسے نوکھا ہار پہنانے والے تھے۔ چاند سی صورت نظر آئی تو دو بہائیاں نہال ہواٹھے۔ انھوں نے غاب میں سوچا اور دیکھا ہو، تو دیکھا ہو زندگی میں تو ہرگز نہیں سوچا تھا کہ ایسی حسین اور پیاری دلہن ابھیں مل بھی سکتی ہے۔ مگر یہ سچ محل چکی تھی، اور اب وہ اس پیاری صورت کی قیمت ایک نوکھے ہار سے ادا کرنے جا رہی تھی کہ کسی نے ذرا ترس بھری آواز میں کہا: "ایڈماں، اتا دزنی ہار بچاری بچی کے گلے میں نکو ماں ابھی سے: "بندہ میں چپ رسم ادا کی کو ڈال دنیا بوبو۔ ابھی پہلے اچ بہت دزن ڈالے کو بیٹھی اٹنے۔" یہ سسرال والیوں میں سے کوئی کھتیں۔

ہار دو بہائیاں کہا تھوں میں لرز رہا تھا۔ "پھر اس کا کیا کروں میں؟" وہ کچھ بھولپن اور شرارت سے بولے: "اگے تمہاری ساکس کے پاس رکھو ادبوجی میاں۔ بعد میں لے لینا۔ نہیں تو ان کے گلے میں ڈال دیو۔"

دلہن پاشلے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ مگر اتنے میں ذرا آگے جھک کے مسکراتے دو بہائیاں ان کے گلے میں نوکھا ہار پہنانے کے تھے اور اپنی قسمت

کو رو چکے تھے، کیونکہ جین ہار کو قبولیت کا درجہ بخشنے کے لئے دہن پاشا ذرا آگے
کو جھکیں تو گہرے اودے رنگ کے ریشمی کرتے کے اندر کچھ ایسا تباہ کن منظر
نظر آیا کہ انھوں نے سوچا کہ ایم ایم یا تو میرا شیما پر گرا تھا یا آج مجھ غریب پر گر رہے
ہیر و شہما پر تو بے شمار ہم گرے ہوں گے۔ مگر یہاں تو دوسری بھولنے والی زندگی تباہ و تاراج
کر دی۔ کیوں کہ اس حویلی میں ایک جان یوا چلن یہ تھا کہ لڑکیاں اندر۔۔۔ کرتوں کے
اندر محرم و محرم کچھ بھی نہیں پہنا کرتی تھیں۔ بس جوہرے سا منہ ہے۔ اور ویسے
بھی سچی بات تو یہ ہے کہ کس کر باندھ رکھنے کی ضرورت تو انھیں پڑے جن کا گوشت
لٹکا چلا آ رہا ہو۔۔۔ یہاں تو جیسے تلوار تہی ہوں۔ یہ معاملہ تھا تو محرم پہنے ان کی جوتی
اب سلامی اور منہ دکھائی کا دور چلنا شروع ہوا۔

اس کی طرف سے سونے کے کنگن دہن کو۔۔۔

”اس کی طرف سے پانچ اشرفی دو لہا پاشا کو۔۔۔“

”اس نے گلے کی تن منی دی۔“

اس نے دو لہا میاں کو گھڑی دیا۔۔۔

ارے کاہے کی سلامی اور کاہے کی منہ دکھائی۔ وہاں تو ایک طوفان مچا ہوا
تھا۔ اب وہ مر کر اپنا دھیان بٹلنے کی سوچ رہے ہیں کہ یہ جو ہماری دہن کی تن منی ہیں
ان کا دوپٹہ کتنا اچھا ادا اور دلہے۔ اس پر کامدانی کتنی اچھی لگ رہی ہے۔ مگر کامدانی
بے ہوشے دوپٹے کو چٹا بولے تو کتنی مصیبت کی بات ہے۔ چھیننے والیوں کے
انگوٹھے ضرور چھل گئے ہوں گے۔ پھر اچانک وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو
گالیاں دینے لگے۔

”ارے جناب یہ فضول باتاں مت سوچئے جو سوچ رہے رہی سوچئے نا

اب اگر وہ دوپٹہ چننے والی مر بھی جائے تو آپ کا کیا بگاڑ کر جائیں گی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ آپ صرف ایک ہی بات سوچنا چاہ رہے ہیں۔ اور خود کو اٹو بنانے دوسری طرف دھیان لگا رہے ہیں۔ مگر میاں آپ میں اصلی اٹو کے پھٹے۔ آپ کو کامدانی کے دوپٹے اور کرتے سے مطلب ہے؟

کرتے کا دھیان آتے ہی ان کے ذہن میں پھر قینچی سی چلنے لگی،۔ اب دنیا میں رنگوں کی کچھ کمی ہے کیا۔ سنہرے رنگ ہی لے لو۔ سنترے کے چھلکے جیسا کتنا اچھا لگتا ہے۔ یا ہر رنگ پتوں کے جیسا۔ پھر ایک جامنی رنگ بھی ہوتا ہے گلابی رنگ ہوتا ہے۔ اور کبھت یہ لال رنگ کدھر مر گیا تھا آج؟ یہ کرتا اور کچھ نیٹس اور کچھ نیٹس۔ اودے رنگ کا ہی ہونا تھا۔؟ اودا رنگ اور ذرا جھک کر دیکھو تو اس کے اندر تباہیاں، بربادیاں،!

ان کے باہر جتنا شور تھا، اندر اس سے بھی کہیں زیادہ غلغلہ مچ رہا تھا اچانک دو لہن پاشا گرمی اور حبس کے اسے بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔
”بھئی اللہ میں اپنے کمرے کو جارہی یوں۔“

ان کے کھڑے ہوتے ہی جیسے کائنات کا سارا سلسلہ اپنی جگہ جامد ہو کر رہ گیا۔

”بیگم صاحبہ آپ کا کیا بگاڑ جاتا جو آج آپ یہ جان لیوا رول دار اٹلس کا پھینسا پھینسا پا جامہ نہ پہن نہ لیتے۔؟“

سادگی اور وہ بھی ایسی قیامت خیز۔ یہاں سے وہاں تک محفل میں چمکی، سلمہ، ستارے، گوٹے ٹھپے، اور زیوروں کی جگمگات تھی، اور یہاں کیا تھا؟ صرف ایک ادا کرتا۔ اودا رنگ پا جامہ اور اودا دوپٹہ بس یہاں ہاں

کا مدانی ضرور دمک رہی تھی۔ دمک کیارٹی تھی دوہامیاں کے نصیبوں پر منہس رہی تھی مگر وہ نوکھا ہار۔۔۔؟ دو اونچے ادبے گبندوں کے بیچ کیسا حقیر ہو کر رہ گیا تھا!

بارت کو واپس تو جانا تھا ہی نہیں کیونکہ داماد "گھر داماد" ملا تھا، اسی لئے گڑ بڑ کے کم ہونے کے آٹا نظری نہ آتے تھے۔ پتہ نہیں ایک بج گیا تھا یا دو بج گئے تھے، مگر یہاں تو نصیبوں نے ایک نہ دو پورے تین بجائے تھے۔ وہ اٹھ کر چلی بھی گئیں مگر دماغ پر دبی چھائی ہوئی تھیں۔ اب لاکھ دوہامیاں ادھر ادھر کی باتیں سوچنا چاہتے ہیں، مگر بعض مرد ایسے ہوتے ہیں کہ باغوں میں بھول، کھلنے کا سماں بھی یاد کرنا چاہیں تو کبکھٹ دماغ میں ہیر و شیمہ پر بیماری کا منظر ہی یاد آتا ہے۔

دلہن چھوٹی سی تھی، الٹھی سی تھی، نادان بھی تھی، اس لئے دلہن پاشلے اپنے کمرے کے برابر کا ہی کمرہ اس کے لئے چنا تھا۔ کیا پتہ رات بے رات، وقت بے وقت اسے مان کی ضرورت پڑ جائے۔

کھانے والے سے فارغ ہو کر حویلی میں رفتہ رفتہ سناٹا ہونے لگا۔ چائے فرشوں پر قالینوں پر جس کو جہاں جگہ ملی، پاؤں پسار کر سو گیا۔ کیا نوکر اینٹ اور کیا بیبیاں،۔۔۔ بس اکا دکا بوڑھی عورتیں یہاں دہاں بلا ضرورت جوان، لڑکیوں کو تھارتی جاگتی دکھائی دے رہی تھیں۔ باقی تو سارے میں سوتا پڑ گیا تھا۔ البتہ دلہن کی سکھی سہیلیاں ڈرائنگ روم میں گھیرا باندھے بے کار کی باتوں سے اس کا دماغ کھاٹے جا رہی تھیں۔ سسرال والیاں کھاپی کر خست ہو چکی تھیں اور دوہامیاں اپنے کمرے میں پہنچا دیئے گئے تھے۔

دلہن پاشا کی نیند تو مدت ہوئے روٹھ چکی تھی، آج بھوک بھی اڑ چکی تھی۔ کتس برس کا بوجھ، جو وہ بہر حال اٹھائے چلی آرہی تھیں، آج اچانک ناقابل برداشت سا ہو گیا تھا۔ دماغ میں، دل میں بس ایک دھکا دھک ہوئے جا رہی تھی۔ انہوں نے اپنے بے پناہ بال، جن میں آج کے دن تک ایک بھی مہرمان کرن نہیں چکی تھی۔ جو ان کے نصیبوں، ہی کی طرح کا لے تھے۔ وہی بے پناہ بال کھول کر بکھرا دیئے کہ سر ذرا ہلکا محسوس ہو۔ صبح صوبور نے عود اور عنبر انگاروں پر ڈال کر، ان کا سر ٹوکری پر رکھوا کر بال خوشبو سے لساٹے تھے۔ بید کی ٹوکری کو تیکہ بنا کر لیٹ کر دف بچپن سے اپنے بال اسی طرح سکھانے اور خوشبو سے لسانے کی عادی تھیں۔ اب خوشبو ڈوں میں لسنے کا ارمان تو کسے رہ گیا تھا۔ ہاں کبھی کبھار نہا کر جلد بال سکھانے ہوتے کہ ابر کے مارے سردی وغیرہ نہ ہو جائے تو وہ ٹوکری سر کے نیچے لیتیں۔ آج بھی خوشبو ڈوں کا سمندران کے سر میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

چُنا ہوا۔ بتی بنا ہوا دوپٹہ انہوں نے اتار کر تنگٹے کے پاس رکھ دیا تھا۔ شور شرابے سے بچنے کی خاطر انہوں نے دالان کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کر لیا تھا۔ وہ دروازہ بھی بھڑا ہوا تھا، جو ان کے اور بی بی تارا کے کمر کو ملاتا تھا مگر اس کی چٹخنی نہیں لگی تھی۔

اچانک انہیں خیال آیا کہ دیکھ تولیں۔ دلہن کے کمرے میں پاندان رکھوا دیا گیا ہے یا نہیں۔ ان کی اپنی زندگی میں بس ایک ہی دن نہرا تھا۔ اور ایک ہی رات رنگین۔ اور اس رنگین اور سنہرے خواب میں پاندان کا بڑا اہم رول تھا۔ جب نواب صاحب نے پان مانگا تھا۔ اور انہوں نے اپنے خنائی ہاتھوں سے لرزے کانپتے پان بنایا تھا۔ اور شرتے شرتے نواب صاحب کے سامنے رکھا تھا۔ تو انہوں نے

بڑی بد معاشی سے کہا تھا ”اونہوں ایسے نمیش۔۔ اپنے ہاتھ سے کھلا سیئے۔“
 اور جب انھوں نے پان فواب صاحب کے مونہہ میں رکھنا چاہا تو وہ پورا ہاتھ ہی
 چبا گئے۔ بلکہ ہاتھ کیا ان کا پورا انگ انگ چبا گئے۔۔ پھر بھی وہ رات کبھی نہ لوٹی
 ”اللہ نہ کرے کہ میری بیٹی کی زندگی سے وہ رات کبھی مونہہ موٹے نہ روز
 وہ رات آٹے میرے اللہ۔۔ انھوں نے تو جھل دل سے سوچا اور بھڑے ہوئے
 دروازے کو کھول کر برابر کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔۔

چھر کھٹ سونے چاندی کا طواں تھا۔ اس پر سونے کے کام کی بنی مسند
 تھی، اور اس پر جو شخص بیٹھا موزے اتار رہا تھا، وہ نہ سونے کا تھا اور نہ چاندی کا۔
 محض گوشت پوست کا ایک انسان تھا۔ ایک جوان انسان، ایک جوان مرد،
 دہن پاشا گھراسی گیش۔ دوپٹہ تو وہیں اُن کے سر پر نے تھی بنا پڑا تھا
 اور وہ یہاں اپنی ساری بلندیوں اور ساری خوبصورتیوں کے ساتھ اودے اودے
 لباس میں کھڑی قیامتوں کو دعوت دے رہی تھیں۔

عورت برہم رہے تو مرد کمزور پڑنے لگتا ہے لیکن گھرائی ہوئی عورت کو دیکھ
 کر ایک مرد کو اپنے مرد ہونے کا پوری شدت کے ساتھ احساس ہونے لگتا ہے۔ اور یہی
 وہ لمحہ ہوتا ہے جب گیموں اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ساری چیزوں میں سب سے زیادہ
 لذت محسوس ہونے لگتا ہے۔

دہن پاشا کو کچھ یاد تھا۔۔ سب کچھ نہیں، کچھ ایسا کہ کسی نے شہر بکاتی
 آواز میں یہ کہا ”آپ کے گلے میں نو لکھا بار کتا خوبصورت لگتا ہے۔“ اور پھر انھیں
 پھول کی پنکھڑی کی طرح ہلکا اور نازک سمجھ کر نخل کے بستر پر بچھا دیا گیا۔۔ اور پھر جیسے
 زندگی بھر کی کھٹوں کا ازالہ ہو گیا۔۔ جیسے وہ سب خواب کی باتیں تھیں کہ برف

گھول گھول کر پانی کو ٹھنڈا کیا جا رہا ہے۔ وہ ٹھنڈے سے بستر پانی سے نہا رہی ہیں اور آگ اور گرمی ہے کہ کم ہوتی رہی نہیں۔ یہ سب انھیں خواب اور جاگتے سوتے کی کیفیت لگی۔ لیکن جب صدیوں بعد انھیں زندہ کیا تو لگتا کہ وقت تو جہاں کا تھا ہی پڑا ہوا ہے سلسلے والے۔ بڑا ٹھنڈا چار جا رہا ہے۔ اور وہ یعنی بنت حوا آدم زادے کی پسلی سے لگی اسی لباس فاخرہ میں ملبوس ہیں جو تمام اہل نے اس دنیا میں بھجواتے وقت انھیں عطا کیا تھا۔

پاگلوں کی طرح وہ انھیں اور شیرنی کی طرح اس شخص پر ٹوٹ پڑیں جس نے اُن کی سولہ سال سے مقفل عبادت گاہ کو تباہ و تاراج کر دیا تھا۔

”تم۔ تم۔ تم جنور۔ تم حیوان، تم میری بچی کا سکھ اُجاڑنے والے ذلیل کہتے، اُجاڑتے ہیں کبھی سکھ نہیں دیں گا۔ اللہ کر دے تم کو کبھی کوئی خوشی نہ ملے...“
 اور وہاں اس مرد کا دل، ذہن، ہر احساس، صرت ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ یہ عورت۔ یہ عورت کس قدر گڑ بڑا دینے والی شخصیت ہے۔ بستر پر جتنی خوبصورت لگی غصے میں تو اس سے بھی سوا ہے۔ بس کیا کروں، چبا ڈاؤں کچا کھا جاؤں؟“

سارے دن دہن پاشا اپنے کمرے سے نہ نکلیں۔ بی بی تارا کا کمرہ برابر میں ہی تو تھا۔ لڑکیاں، بالیاں، دہن کی جان پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ بس ایک ہی سوال تھا آری بتانا گئے رات کو کیا کیا ہوا؟“

بی بی تارا جیسی بھون بھالی۔ اب اسے کیا پتہ کہ پہلی رات کو کچھ نہ کچھ ہونا سرزد ہی نہیں ہے۔ وہ ہنس ہنس کر بات کو ٹالے لگی۔

عصر کے لگ بھگ دہن پاشا انھیں۔ گناہ کا بوجھ انھیں اٹھنے ہی نہ دیتا

تھا۔ بوجھل دل، بوجھل ضمیر اور بوجھل پیروں سے چلتی غسل خانے گئیں۔ نہا کر زرد رنگ کا کرتا پا جامہ پہنا، دوپٹہ اوڑھا، عصر کی نماز پڑھی۔ اور ہر چند کہ عصر کی نماز کے بعد مسجد سے میں گرنے کی اسلام میں ممانعت ہے۔ لیکن وہ اپنے بوجھل اور گناہ گار دل کی مار سے اتنی شرمندہ تھیں کہ مسجد سے میں گر کر ماتھا گر گر کر خوب روئیں۔ اتنا کہ جانماز کا اتنا حصہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ مگر ان کے دل کی بھڑاس نہ نکلی۔ بس ایک ہی دعا لب پہ آٹے جاتی۔
 ”خدا یا۔ مجھے معاف کر دے۔ مالک میں بہت بڑا گناہ کری۔“

مجھے موت دے دے۔“

رات کے کھانے پر سب کا سامنا ہونا ضرور ہی تھا۔ وہ باہر باہر آئیں تو داماد تو کیا سب دیکھتے ہی رہ گئے، ملکوتی حسن زرد رنگ کے جوڑے میں اور بھی دمک رہا تھا۔ سوگوار چہرہ ہزار بناؤں سنگھار والے چہروں سے بالاتر نظر آ رہا تھا۔

داماد نے سلام کیا، مگر انداز میں بے پناہ شرمندگی اور ندامت تھی ان کا جی چاہا، سلام کے جواب میں جوتا کھینچ ماریں مگر ساری دنیا دیکھ رہی تھی اس نے غصہ گردن خم کر کے اپنی بڑائی ظاہر کرنا چاہی۔ لیکن کسی نے دھیرے سے جیسے کان میں کہہ دیا ہو۔ ”وہ تم سے دس سال بڑا ہے۔“ انہوں نے گھبرا کر سر اٹھایا اور ادھر بھرا ایک مرد اپنے آپ کو مرد محسوس کرنے لگا لیکن انہوں نے خود کو سختی سے سمجھایا۔ ”اونہوں۔“ انے میرا داماد ہے۔“

وادی حضور سمجھیں، پتہ نہیں پوتی کے ساتھ دولہا میاں نے کیا

اودھم مستی مچی ہو، اس لئے نوکرانیوں سے کہہ دیا۔ ”آج رات بچی آرام کریں گی۔ ننھی سی جان کو روزِ روزیہ آفت نکوٹ۔“

دولہا میاں کو یہ سندیہ پہنچا دیا گیا کہ بیٹا آج گرہ بڑ نکوٹ۔ ایکلے ایکلے اچ سوؤ۔“

بارہ بجے۔ ایک بجے۔ پھر دو بجے۔ پھر ساتھ والے کمرے سے بتی بجھانے کی آواز آئی رات والی بتی شائد ابھی جل ہی رہی تھی کیونکہ دروازوں سے نیلی نیلی روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔

پھر رات کا ایک اور پہرہ بتیا۔ باغ سے موگرے چنبیلی کی سنکھتی ہوائیں دستکوں پر دستکیں دینے لگیں۔ بی بی تارا دادی کی محفوظ باہنوں میں سوئی پڑی تھی۔ سارا جگ ہی سویا پڑا تھا۔ صرف وہی جاگ رہی تھیں۔ لاکھ نہ چاہنے پر بھی ایک نہ ایک بتی گھڑی یاد آرہی تھی۔

سوچتے سوچتے دماغ بو جھل ہو گیا تو انھوں نے چوٹی کھول ڈالی کہ اس طرح دماغ کو اور سر کو بوجھ سے نجات ملے۔ بال بکھرتے ہی عودِ عنبر کی جان لیوا خوشبو سارے میں پھیل گئی۔

پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ دروازے تک پہنچیں اور ہلکے سے دھکا دیا۔ کوئی جیسے تاک ہی نہیں تھا۔

”آپ! دولہا میاں قریب آکر حیرت اور خوشی سے بولے

وہ بے بس سی ہو کر بولیں۔ ”آج میں پھر نوکھا ہا رہی ہوں۔“

ستا کوشت

”پان تو نیا کو دے دی، اب ہونٹاں میں ہونٹاں بھی دے دے۔“
 بھول نے سنا، مگر یوں ہی احمقوں کی طرح کھڑی ان کا منہ دھکتی رہی
 ”ہم کیا بول رہے، تو بسنی سنیں کیا چھو کری؟“

پھر بھی وہ نہ سمجھ سکی۔ یہ ٹھیک ہے کہ محل کے اندر داخل ہوتے ہوتے
 اس کی ماں نے کافی ہدایتیں اس کے کانوں میں انڈیل دی تھیں۔ جن کا خلاصہ کیا جاسکتا
 تھا تو بس یہی کہ نواب صاحب جو بھی کرنے کو بولے تو تو وہی اپج کرنا۔ ”لیکن
 وہ خصوصیت سے اس وقت بہت حیران تھی کہ ہونٹوں میں ہونٹاں ”کیونکر دے
 ویسے اس سے پہلے نواب صاحب اس سے جو بھی سوال کرتے رہے تھے۔ وہ بڑی ہی
 سعادت مندی سے ہر سوال کا جواب دیتی رہی تھی۔ جب وہ کمرے میں داخل
 ہوئے تھے تو ایک کونے میں قالین سے ہٹ کر ننگے فرش پر سر جھکا شے بیٹھی تھی
 انہوں نے اسے وہاں سے اٹھ کر دیوان میں بیٹھنے کو کہا تھا۔ تو وہ جھجکی ضرور تھی۔

کہ ایسے غلیں گردوں والے دیوان پر کیوں کر جا چڑھے۔ لیکن ”امنی“ نے کہہ دیا تھا۔
 ”نواب صاحب کا کہنا ٹالیں گی تو ٹانگیاں پوٹاں گارکھ کو چیر دیوں گی۔“ اس
 لئے وہ بڑی متانت سے ایک کونے میں سکڑی سمٹی سہمی جا بیٹھی، ہمتی۔ پھر نواب
 صاحب نے قریب آکر ذرا مسکرا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا تھا ”نام کیا ہے بی بی
 مہسارا؟“

بچپن سے اتناک تیرے میرے گردوں کے بتن بھانڈے دھوئے بھاڑ
 بھاڑ کرتے اور چھپناں بندوڑی، حرم زادی جیسے خطاب سنتے سنتے جس کا سارا
 وقت کٹا ہو۔ اچانک اپنے آپ کو مہنی بی بی جیسے خطاب کا اہل پا کر اس قدر
 خوش اور ساتھ ہی حیران سی رہ گئی کہ اسی لمحے اس نے فیصلہ کر لیا ملتے اچھے بناب
 صاحب تو سچی جوبلے تو وہی اچ کرنا۔ میرے جیسی غریب چھو کری کو بی بی بولے
 رہیں تو ضرور انوں بہت اچھے ہو میں گے۔

اُسے خاموش دیکھ کر نواب صاحب نے اپنا سوال دہرایا تھا: ”ہو بی بی، تم
 اپنا نام نہیں بتائے۔“

”جی — بھولی۔“

نواب صاحب پر سنہی کا ایک دورہ سا پڑا۔ بڑا عجیب و غریب نام تھا
 کم سے کم اب تک تو ان کے کانوں سے ہو کر گزرا نہیں تھا۔ مگر اب جو انھوں نے
 غور سے دیکھا تو واقعی وہ انھیں اتنی بھولی نظر آئی کہ اس کے علاوہ اُس کا کوئی اور
 نام ہو ہی نہیں سکتا۔ ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔

”کچھ پڑھی دڑھی ہے تو؟“ انہیں پیار آیا تو ”تم سے فوراً تو پیرا تر آئے۔
 ”الیا چ مہولی سا“ وہ ناک کو حقیقت سے مسکڑ کر بولی۔ بس خط پڑھے

لکھے جتنا۔“

اپنے ماحول سے اسے مانوس کرانے کے لئے وہ خواہ مخواہ کی باتیں کئے گئے۔
”ہو رکھانا پکانا آتا؟“

”جی ہو۔“ وہ بڑی فرماں برداری سے بولی
”کیا کیا آتا؟“

”جی۔۔۔؟ دال، خشک، روٹی، سب، سالنے، اٹلی کاکٹ، تلی کی
چٹنی، ٹماٹے کا کھٹا....“ سب غریبانہ پکوان
نواب صاحب مزے لے لے کر سب سالنوں کے نام سنتے گئے۔ پھر بیچ
میں بولے ”ہو رشامی کما ہاں، خورمہ، بریانی، پلاؤ، پسندے، خیمے کے پر لکھے
یہ سو ب نیٹیں آتا۔؟“

وہ بڑی عسرت سے اُن کے مونہہ کو دیکھ رہی تھی۔ جب وہ رُکے تو وہ
ذرا اٹک اٹک کر بولی ”مگر یہ سو ب چیزاں تو گوش سے بنتے نا؟
وہ ہنسنے“ ہاں گوشت سے تو بنتے۔ مگر تیرے کو پکانے آتا تو ہوٹیں
گکانا؟“

اب کے پہلی بار وہ ہنسی۔ اور نواب صاحب کو ایسا لگا کہ: اس کی معصوم
اور دلکش ہنسی کی چھوٹ جو پڑی تو کمرہ جیسے اجالوں سے بھر گیا۔ وہ ہنستے ہنستے
بولی ”نواب صاحب، ہمارے ہاں گوش نیٹیں آتا۔ ہو رہ جب گوش ہی نیٹیں
آتا تو گوش کے پکوان کیسے آئیں گے۔؟“

”تو مطلب یہ کی تم لوگاں گوشت کھاتے ہی نیٹیں۔“
”نیٹیں نیٹیں، ایسا تھوڑی ہے۔ ہم سال کے سال بخر عبید پر کھاتے

پاس پڑوس والے خربانی ہوتی تو حصہ بھواتے کی نہیں۔؟“

اچانک انھوں نے موضوع بدل دیا۔ پتہ کیوں ان کا دل اس چھوکری کی غریبی کا حال سن کر بے چین ہو گیا تھا۔ وہ بڑی محبت سے بولے

”ہو رپان بنانا آتا کی نہیں؟“

اُس نے خوشی خوشی جواب دیا۔ ”ہو، پان بنانا تو بہت اچھے سے آتا۔ میری امی پان کھاتی ہے۔؟ وہ کام میں رہتی تو میرے کو اچ بولتی۔“ بھولی اذرا پان تو بنا کے دے دے ایک۔، کبھی کبھی تو میں خود بھی کھالیوں تو امی بہت ڈانٹتی۔ پن آج تو میرے کو امی خود کھلا لے کو آئی۔ یہ دیکھئے۔“

اور اس سے اپنے سرخ انگارے جیسے ہونٹ ناب صاحب کو گھوم کر دکھائے

تو وہ خود بھی انگاروں کی طرح دہک لگے۔

ایک نور دار پان۔۔ انھوں نے ٹوٹے ٹوٹے لمبے میں سمجھایا۔

شراب کباب۔ پھر مرغی کھانوں، ترتراتے میٹھوں سے نپٹ کر وہ سیدھے اسی کمرے میں چلے آئے تھے، جہاں روزان کی سیج پر ایک نئی اور کوری جامدانی کی طرح سل سل کرتی لٹکی موجود ہوتی۔

میٹھے میں شکر زیادہ تھی۔ حلی تک چلا آ رہا تھا۔ ایسے میں پان کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

بھولی نے پان بنا کر دیا تو اپنے ہونٹوں سمیت ان کے قریب چلی آئی تھی۔ وہ تپ رہے تھے۔

”انگلیوں میں پکڑ کر پاناں تو مادوں بہنا بھی کھلا سکتے۔“ وہ ایک گرم سی سہنی چمکے۔

”یہ ہونٹاں کس کے واسطے ہیں؟ پان تو بنا کو دے دی۔ اب ہونٹوں میں ہونٹاں بھی دے دے۔“

جالی دار کھڑکی کے نیچے اُدھر کھڑی امنی منتظر رہی کہ اب بوسوں کی پٹا پٹ شروع ہوگی، مگر معلوم ہوتا تھا کہ بھولی یا تو کچھ سمجھ نہیں رہی ہے یا شرما رہی ہے۔ وہ اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔ ”اب یہ اِنے چھناں بے ذنول کی شرم لے کو بیٹھ گئی تو بھلا نواب سب کٹے کو انعام اکرام دیتے پھریں گے؟ ہو رہی یہ سخت تو پھر بار بار آنے والا نہیں۔ موتی کی آب ایک بار اتری سوا تری وہ تو کہو راند کی خسرت تھی کہ خفل کھلائی کے واسطے کینوں کی نظر میں وہ جج گئی نہیں تو ایسے ایسے تو کہتے کہتے چھو کرایاں حیدر آباد میں پڑے سڑے ہوئیں گے۔“ امنی نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے آپ میں گم کو سا پیٹی شروع کر دی۔

”اگ لگے چھناں کی شرم کو۔“ پہلے اچ جتا کو اندر بھجائی تھی کہ شرمانا اور مانا مت۔ جو بھی بوے سو کرنا۔ کوئی بھی بات کو نکوٹ کو مت کرنا۔ آخر دس روپے خرچ کر سوا دی کچھ تو منگے گا۔ اب یہ مونڈی کٹی.....“

مگر خوش بختی کے نقائے کی طرح آخر وہ چوٹ پڑ ہی گئی۔ بڑھیلے دولوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ ”مالک تیری دین کے سو طریقے ہیں۔ شکر ہے۔“

ان ہونٹوں کا سارا رس جیسے ان کے جسم میں پھیل گیا۔ انھوں نے شرار ہو کر کہا: ”اب یہ سوب کپڑے اتار دے۔“

اس نے منہ پھیر کر ایک ایک کر کے سب کپڑے اتارنے شروع کر دیئے۔

ابپر سے جو بھی تھی سو تھی، اندر سے تو سنگ مرمر کا مجسمہ نکل آیا ہو۔ جیسے وہ بی بی ہاشمی کا بپتی سالن میں نے کر بونے "اب ادھر آ جا۔"

اس نے مارے شرم کے اپنے کھلے بال دو حصوں میں سامنے کر کے اپنی عزائی ڈھانپنے کی ناکام سی کوشش کی۔

وہ اٹھے، اُسے اپنے قریب کیا۔ خوبصورت نوخیز مردیں اُبھاروں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر انھیں ایک دوسرے سے قریب کر کے انھوں نے پیچ میں اپنی ناک رکھ دی۔

"ہاں!" زور سے سونگھ کر انھوں نے کہا۔ "خدا کی قسم، تو بالکل کوری اور کنواری ہے۔ ہم نوی چھو کری اور نوے کپڑے کی خوشبو سونگھ کر ہی بتا سکتے ہیں کہ یہ استعمال شدہ ہے کی نوا۔"

اُن کے ہاتھوں کے لمس سے اس کے کنوارے جسم پر چھوٹے چھوٹے ریش اُبھرا اُٹے۔ وہ بہر حال ایک سولہ سال کی لڑکی تھی۔ پاکباز تھی، لیکن جب ان حالات سے دوچار ہونا پڑے تو اتنی عقل تو ابھی جاتی ہے۔ جو یہ سمجھ سکے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ کیونکہ بہر حال اس کی امنی کو پیشگی دس روپے دے جا چکے تھے اور دنیا میں کوئی کسی کو یوں ہی پیسے نہیں دیا کرتا۔ ویسے یہ اس کا بے پناہ حسن اور خدا کی نہر بات ہی تھی کہ اسے دس روپے دیئے گئے۔ ورنہ فضل کھلائی کی رسم کے دو روپے تو بندھے ہوئے تھے۔

نواب صاحب اُسے اس قدر دبوچ کر گہری نیند سو رہے تھے کہ وہ ہل جل بھی نہیں سکتی تھی۔ اُترتی رات میں اُن کی نیند کچھ ہلکی پڑی تو اسے بھی سکون سے

سائنس لینا نصیب ہوا۔ نواب صاحب کے برابر سونا اُسے کچھ عجیب سا لگا۔
چاہا کہ اتر جائے۔ سوچا ناخن ہو جائیں گے۔ اتے تڑے نواب ہیں۔ کھڑے
کھڑے مروا دیا تو۔؟ زندگی تو ہر حال میں پیاری ہوتی ہے۔ غریبی سے ہی
سہی زندگی، زندگی ہے۔ وہ پائنتی کی طرف لیٹ گئی، نیند تو کانٹوں پر بھی
آجاتی ہے۔ وہ تو پائنتی تھی۔ پائنتی بھی کس کی اور کیسی؟ نواب صمدیار
جنگ کی،۔۔۔ محل کی اور ریشم کی۔ وہ وہیں سو گئی۔

صبح صبح نیند کے زور میں نواب صاحب نے ایسی زور کی لات ماری
کہ وہ پٹ سے نیچے جا گری۔ بوکھلا کر دیکھا تو سوز نکل آیا تھا اور وہ بالکل ننگی
تھی۔ اس نے لپک کر اپنے کپڑے اٹھانے چاہے۔ سائینہ قد آدم آئینہ تھا۔
خوبصورت اور بے مثال خملیں جسم پر یہاں وہاں نیل، چمکیوں کے نشان
گردن سے نیچے۔ اور نیچے۔ اور نیچے۔ دانتوں کے نشان جوتا
بھر میں کھٹی رنگ اختیار کر چکے تھے۔ جیسے کتے کچے گوشت کو
کھنچوڑتے ہیں۔

اس نے ڈر ڈر کر، پلٹ پلٹ کر سوٹے ہوئے نواب کو دیکھتے ہوئے
محم کرتا، پا جامہ سب چڑھایا۔ دوپٹہ اڑھا۔ اور ہولے سے دروازہ کھول
کر باہر نکل گئی۔

دیوار سے لگی بڑھیا ادنگھتے ادنگھتے چونکی اور اپنی بیچی کو بہان کر
پکی ہوئی آئی۔

”کچھ انعام ملا کی نہیں، بھولی۔ کیوں کی سبھی لوگاں بولتے کی نواب
صاحب بہت بھی بہت غریب پرور ہیں۔؟“

دوپٹے کے کونے میں بندھے ہوئے، رات نواب صاحب کے دئے ہوئے پانچ روپے کھن کھنارہے تھے۔ اس نے کونا ماں کی طرف بڑھا دیا اور زخمی آواز میں بولی ”ہوامنی نواب صاحب بہوت دل دلے ہیں۔ بہوت رحم دالے ہیں۔“ صبح کونا شستے میں شامی کباب اور سارے لوازم دیکھ کر اچانک نواب صاحب کو رات والی لڑکی یاد آگئی۔ انھوں نے اپنے محمد خاص کو بلایا اور ذرا فکر مند لہجے میں پوچھا۔ ”رات کو جو چھو کری محل کو آئی تھی وہ کال رہتی۔؟“

محمد خاص بڑبڑا گیا۔ نواب صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ایک بار جو بھی چیز استعمال کر لیں۔ چاہے وہ لڑکی ہو یا جوتی، کپڑا ہو یا موتی، دوبارہ گزر استعمال نہیں کرتے۔ تو پھر آج یہ گزری ہوئی رات کے سائے کے پیچھے لپکنا کیسا؟ ذرا رکتے ڈرتے اس نے جواب دیا ”جی حضور۔۔۔ وہ چار مینار سے کچھ آگے کوٹلہ عالی جاہ ہے نا، اسی کے غریب اس کا گھر ہوتا۔“

گوشت کے پکوان اور شامی کباب ان کے حلق میں اٹک رہے تھے۔ انھوں نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اُٹھتے ہوئے بولے۔ ”ڈرائیو سے بولو۔“ کی گاڑی نکالو ذرا۔ اور سیدھے زنان خانے کی طرف لپکے۔

بی اماں چاندی کی پلنگڑی پر چاندی کا پاندان کھولے اپنی رعیت میں گھری بیٹھی تھیں۔ سرکار کو آتا دیکھا تو ساری رعیت چھٹ گئی۔ نواب جا کر ماں کے گلے کا ہار ہو گئے۔ بی اما بڑی حیران کہ بے بات آج یہ پیار کیوں پھٹا پڑ رہا ہے۔ الگ ہو کر دعائیں دیتے ہوئے بولیں۔

”خدا خیر کر و آج یہ ہاتھوں میرے گلے کا ہار کاٹے کو ہو گئیں؟“

”اماں جانی انھوں نے منہس کر کہا ہم ایک لڑکی پسند کر لئے۔ آپ کی

اجازت ہو تو شادی بھی ہو جائے۔

بی اماں کو اوبدا کر عفتہ آگیا۔ ”میاں بن ناصح کو میراجی نکو جلاؤ۔ ابا
بول بول کے یہ عمر کر لئے۔ چالیس سے ادب پر ہی ہوئیں گے مہتیں۔ تمہارے
عمر والے تو ناتی تو اسوں والے بن بن کو گئے اور تھے بس میرے کو جلا لیتے ہی
بیٹھے۔“

بی اماں مذاق ہی سمجھ رہی تھیں۔

”نیش اماں جانی، ہم سچی بول رہے ہیں۔ آپ خود دیکھیں گے تربتہ چلیں
کہتی اچھی لڑکی ہے۔ بس یہ ہے کہ ذرا کم پڑھی لکھی ہے۔ ہو ذرا غریب گھر کی ہے
بی اماں کے چہرے پر ذرا سے یقین کی پرچھائیں ابھری، دل کی خوشی کو،
چہرے پر آنے سے روک نہ سکیں مسکرا کر کہنے لگیں۔ ”لگے میاں ہنسا، کون سے
بہو کو نوکریاں کرانا ہے کی اس کو بہت تعلیم ہونا۔ خط لکھی پڑھی سولیں ہے
ہو غریبی کی بات تربتہ ہے میاں کہ ہم کو اللہ اتنا دیا۔ سواب بیٹوں والوں کی غریبی
کا کیا غم؟ اتنا ہے کہ بس عزت دار لوگاں ہوتا۔“

عزت! نواب صاحب کو یہ سمجھتا دے کے ساتھ گزر ہوئی رات کا
خیال آیا۔ وہ کلی جو ان کے اپنے ہاتھوں پھول بنی تھی، کیا اس کی پاکیزگی اس
کا بھولپن کسی اور ثبوت کا محتاج تھا؟ وہ ذرا غم ناک سی مسکراہٹ کے ساتھ
بولے۔ ”اماں جانی وہ لوگاں تو اتنے عزت والے اور اتنے پاکیزہ اور بھولے
ہیں۔۔۔۔۔ کہ فرشتے بھی ان کے دامن پر نماز پڑھنے میں اپنی بڑائی سمجھنا
”تم پھر میں شادی کے تیاریاں شروع کر دہیوں۔“ بی اماں خوشی کو دیتے
ہوئے بولیں۔

”جی ہو۔“ اُٹھتے اُٹھتے انہوں نے سعادت مندی سے کہا
 — اور دل ہی دل میں سوچنے لگے۔ ”دس روپے پیشگی اور پانچ روپے
 بخشش کے۔ اُن پندرہ روپوں کا کفارہ بس اسی طرح ہو سکتا ہے کہ مہر
 پندرہ لاکھ بندھوا لیں۔“

موٹر میں بیٹھنے سے پہلے انہیں کچھ خیال آیا تو وہ پھر اُسے پاؤں
 بی اماں کے پاس آئے۔

”ایک بات سنئے اماں جانی۔ شادی بھر جتنے بھی پکواناں بکس
 گئے، سب گوشت کے ہوئیں گے۔“

بی اماں نے ان کے چہرے کو ذرا حیرت سے دیکھا اور کہا: ”اے
 میاں، تھے گوشت کے اتنے بھی شوخین کب سے ہو گئے؟“
 وہ منہ سے کچھ نہ بولے۔ مگر ایک میٹھی سی مسکراہٹ نے ان کے
 پوسے چہرے کو چاند کی طرح روشن کر دیا۔

اللہ کے نام پر

گوری پاشا نے مریم کو دودھ جیسا سفید لباس پہنا کر عطریات اور خوشبوؤں میں ڈبو دیا۔ اُٹن اور چسکہ مل کر نہلانے سے آگے ہی اس کا رنگ سونے کی طرح دمک اٹھ اٹھا۔ پیٹھ پر سنہرا آبخارا مڑا پڑ رہا تھا۔ سبز آنکھوں میں سرے کی باریک سی لکھاؤٹ نے اٹھا ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ بسنریشمی چوڑیاں گوری پان کلائیوں میں کبھی جارہی تھیں۔ رہی سہی کسر بچے سفید موتیوں کے زیور نے پوری کر دی، کمرہ عود، لوبان اور کچے اگر کی قرانوں کو دیوانوں میں بدل دینے والی خوشبو سے سلگ اٹھا تھا۔ سمندر جھبگوں کی سی سفید چادر پر قبہ رو بٹھا کر گوری پاشا نے مریم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اور لرزتی کا پتی آواز میں آسمان کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"میرے اللہ تیرے نام پو آج اس کنواری کو سدا کنواری کا روپ دے کر چھوڑ رہی ہوں۔ مالک! میرے اس تخیر چڑھاؤ

کو قبول فرما اور میرے حسن بانو کے سہرے کے پھولاں کھلا
دے۔ اس کو زندگی نصیب کر۔“

مارے رقت کے ان کی آواز نے دم توڑ دیا۔ پاس کھڑی شمشاد
بوا کی حالت تہا در غیر تھی۔ اکھنوں نے کھڑے کھڑے دوپٹے کا میل بوسیدہ
آپٹل منہ میں با لیا مگر پھر بھی سسکی نکل ہی گئی۔

گوری پاشا اپنی رقت بھول کر جل کر مٹیں اور تراخ سے بولیں
”اے اب تے کائے کو بول لے ریش۔ کھن کھن تمارے ہاتھوں کو

پانچ سو روپے گن کو نہیں رکھ دی کیا میں؟“

ماتاکا ماری شمشاد بوا منہ سے کچھ نہ کہہ پائی۔ کہتی بھی کیا؟ یہ
حقیقت تھی کہ دو دن پہلے ہی گوری پاشا نے ایک نہ دو پورے پانچ سو
روپے شمشاد بوا کی جھولی میں گن کر ڈال دئے تھے۔ میاں دو روپے ماہوار
پر ڈیڑھ کی در بانی کرتے تھے۔ وہ خود چار روپے ہینے سے مانا گیری
کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ خدا کا شکر تھا کہ پیٹ بھر روٹی اور سال میں
دو جوڑے جب زکوٰۃ بٹتی تھی مل جاتے تھے۔ صبر والی بی بی تھیں۔ اس سے
زیادہ کی انھیں حاجت تھی بھی نہیں۔ بٹیا مریم ابھی آٹھ نو برس کی ہی تھی
اس کی فکر بھی کیا تھی۔ جس طبقے سے شمشاد بوا تعلق رکھتی تھیں وہاں
لڑکیوں کی شادی کے لئے نہ کسی جوڑ جھاڑ کی ضرورت ہوتی ہے نہ اندیشوں
کی۔ جوانی جب چپکے سے دستک دیتی ہے تو پاس پر دوس میں اچھا لڑکا
دیکھ کر دو جوڑے دے کر بیٹی بڑا کر دی جاتی ہے۔ ایک جوڑا لال نکاح کا
ایک جوڑا ہرا۔ دوسرے دن چوتھی کا، قصہ ختم۔ اسی لئے مریم کی انھیں

کوئی فکر نہ تھی اور وہ اسے محلے کے مولوی صاحب سے قرآن شریف اور اردو پڑھنے پابندی سے بھیج رہی تھیں کہ لڑکی اللہ رسول کے نام سے تو واقف ہو جاوے۔ لیکن قسمت۔ اونڈھی قسمت نے کس کا ساتھ دیا ہے؟ میاں درباری کرتے کرتے ایک دن درد کی شدت سے نڈھال ہو کر ڈیوڑھی کے قوی ہیکل دروازے پر گر کر ترپنے لگے۔ بڑی دوڑک دوڑاچی۔ حکیم صاحب بلوائے گئے۔ پتہ چلا پیٹ میں جس جگہ شدید درد اٹھ رہا ہے وہاں بڑی سی رسولی پیدا ہو گئی ہے۔ علی میاں عمر کے اس دور میں تھے کہ مر بھی جاتے تو کس کا نصیب لے کر جانے والے تھے؟ مگر جیتے جی کو یوں ہی چھوڑا بھی نہیں جاسکتا۔ دور و پے مہینے کی آمدنی بھی گئی۔ دودقت کا کھانا بھی گیا اور اوپر سے علاج معالجہ الگ۔ نہ اچھے ہی ہوتے تھے نہ مری چکتے تھے۔ پھر شمشاد بوا کو آئے دن ان کے درد کے دوروں کی وجہ سے بھاگ بھاگ کر کام کاج چھوڑ چھوڑ کر جو جانا پڑتا تھا اور کام میں ہرج جو ہوتا تھا اس کا پیسہ گوری پاشا الگ کاٹ لیتیں۔ بڑے نواب صاحب نے کبھی کسی سوالی کو داپس نہیں پھیرا۔ ہمیشہ ساتھ دسترخوان پر بٹھال کر کھانا کھلاتے اور بات بستر تک پہنچ کر ختم ہو جاتی۔ ممکن تھا کہ شمشاد بوا کبھی بڑے نواب صاحب تک اپنا سوال لے کر پہنچ بھی جاتیں لیکن وہ اپنی عزت کو ڈرتی تھیں۔ چند ٹکے ہی تو سب کچھ نہیں ہوتے۔ روپیہ تو پھٹان سے بھی تھوڑے بہت سود کے ساتھ مل ہی جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سود بڑھتے بڑھتے اصل سے بھی گزر جاوے۔ ادویوں کے پھر حریص نگاہیں کچی کلیوں تک پہنچ کرنے کی سوچنے لگیں۔

پھٹان سے لی ہوئی چھوٹی چھوٹی رقمیں چار سو کی خطیر رقم بن کر ناگ کی طرح دن رات شمشاد بوا کو ڈسا کرتیں۔ میاں جئے مرے برابر تھے۔ بس دنیا سے ان کا اتنا ہی تاثر باقی رہ گیا تھا کہ مدہوشی کے عالم میں بھی منہ کھول دیا کریں۔ اور کوئی چچوں سے ان کے منہ میں اُن پانی ٹپکا دیا کرے زندگی کا سارا وبال تو شمشاد بوا کو سمیٹنا تھا۔ ابھی ہفتہ بھر پہلے ہی پھٹان نے کہلوایا بھیجا تھا کہ تمہارے ہاں تو ایسی کوئی قیمتی چیز بھی نہیں جس کی قرتی یا نیلامی ہو سکے، لے دے کے ایک چھو کری ہے، تو تم چاہو تو اسے ہمارے نکاح میں دے دو۔ بڑی ہونے تک ہم کھلا پلا لینگے۔ بعد میں دواغ دے دینا شمشاد بوا کا تو دل ہی دہل گیا۔

”ایسی ننھی سی، سچ سج کلی کی سی بچی، نازک چٹریا کا ساتن۔ اس پھٹان کو لاج نہ آئی ذرا۔ ان کی راتوں کی نیند اُڑ کر رہ گئی۔“

لیکن ابھی دو دن پہلے کی بات تھی مریم مدرسے سے سبق لے کر لوٹی تھی اب وہ اچھی طرح اردو پڑھ لکھ لیتی تھی۔ نماز بھی پوری یاد ہو چکی تھی اور نو سال کی ننھی سی عمر میں قرآن شریف کے کئی دور بھی ہو چکے تھے وہ ابھی اپنی ماں کو اول کلمہ طیب سنا ہی رہی تھی کہ خلاف معمول گوری پاشا صحن میں آنکلیں اور بڑی محبت سے بولیں۔ ”ایو تیرا خزان شریف بھی ہو گیا، نماز و نماز سب یاد کر لی، پھر ابھی تک کا اول کلمہ اچ پڑھتی رہتی؟“

مریم کچھ شرما کر بولی ! نیٹیں پاشا، مولوی صاحب بولتے نماز اور خزان شریف کا ایسا ہے کہ روز کا روز آموختہ کرتے رہے تو یاد رہتا نیٹیں تو انسان

بھول جاتا۔ اسی واسطے میں روزای کو پڑھ کو سنا تہوں ۔
 ”اچھا اچھا“ کہہ کر گوری پاشا ذرا ہنسیں اور کہنے لگیں ”اسن گے
 مریم ذرا چوک کے حلوائی کئے سے سیر بھر جلیبی تو لے کو آجا۔ تیرا خزان شریف
 ختم ہوا پر میں کچھ بھی نہیں کرٹی۔“

مریم کچھ شرمائی مگر اٹھوں نے پیسے اس کے ہاتھوں میں تھما ہی دیئے
 شمشاد بوا اس بلا وجہ کی مہربانی سے بری طرح خائف ہوئی جا رہی تھیں کیونکہ
 وہ اپنی ساری زندگی اسی ڈیوڑھی میں گزار چکی تھیں اور خوب جانتی تھیں کہ
 جہاں گرٹھا ہو پانی وہیں ٹھہرتا ہے، گوری پاشا کی محبت مطلب سے خالی
 نہیں ہو سکتی۔

جیسے ہی مریم ٹلی گوری پاشا شمشاد بوا کے پاس کھسک آئیں اور
 گرٹا گراتے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ”شمشاد تو اس گھر کا نمک کھائی دی
 ہے۔ میں کبھی کچھ مانگی تو انکار تو نہیں کریں گی تو؟“
 شمشاد بوا گھبرا کر بولیں! پاشا میرے پاس بیچ کیا بول کے؟ پر
 آپ جو مانگو حاضر کر دیں گی۔۔۔“

گوری پاشا روئے پر آگئیں! تیرے کو معلوم نا شمشاد میری صن بانو
 پورے ستادیس سال کی ہو گئی۔ کال کال منتاں مرادیں نہیں مانی، کیا کیا
 تڑچوڑ نہیں کری۔ پچاس ہزار کی جائیداد جہیز کے نام پوکھ کے چھوڑیوں۔
 سرد نگردالی نوی ڈیوڑھی جہیز میں ڈال کر رکھی یوں کہتے، زیوریں، بھاری بھاری
 کپڑے لٹے سب کچھ کر کو بیٹھ گئی۔ مگر اللہ صورت دیا سو ایسی کی کوئی آج
 تک ایک بار دیکھ کر جا کو پلٹا آج نہیں۔ اب میرے کو پیر و مرشد مشورہ

دشمن کی تہ اللہ کے نام پہ ایک کنواری لڑکی عمر بھر کے واسطے چھوڑ دیوے۔
 عمر بھر اس کی شادی ہونا نہ اُسے کسی مرد کا منہ دیکھنا۔ ایسی منت کرے
 تو جلدی سے بیٹی کو بر مل جاتا۔ اب میں اپنا دامن تیرے سامنے پسارتیل
 تیری چھو کر اللہ رسول سے واقف، نماز، روزہ اس کو آتا، انے ایک
 کمرے میں پڑی رہے گی اور تمام زندگی خدا کی عبادت کریں گی، پھر وہ ذرا
 رک کر بولیں؟ میں تیرے کو پورے پانچ سو روپے دیوں گی۔ ایسا مت
 سوچ کہ تیری بیٹی کو لے لیوں گی۔ پھر اللہ کے نام پوچھا ایسی تنگی بھوک
 نذر سقڑی چڑھا دوں گی، موتی مونگا، کپڑا لتا بھاری سے بھاری پہنا
 کو چھوڑ دوں گی،۔“

شمشاد بوا کا سر گھوم رہا تھا۔ ایسی عجیب و غریب مانگ! یہ حقیقت
 تھی کہ انکار فضول تھا۔ وہ انکار کرتیں تو آج کھڑے کھڑے نوکری سے نکلوا
 دیں! باتیں پھر بیمار میاں اور جوانی سے قریب آتی ہوئی لڑکی کو لے کر کہاں
 جاتیں۔؟ اور پھر جو پٹھان دانت نکالے بیٹھا ہوا تھا۔ گھبرا کر انھوں
 نے ایک دم حامی بھری۔

”مگر دیکھو شمشاد بوا مریم کو عمر بھر کنواری رکھنا پڑیں گا۔ کتا بھی اچھا
 پیام آؤ تمہاری نیت نیٹیں بدلنا پھر۔“

شمشاد بوا کو ذرا ہنسی بھی آئی، ہم جیسوں کی بیٹیوں کو کدھر کے
 اچھے پیام آئے کو پڑے؟ انھوں نے رضا مندی میں منڈیا ملا دی اور
 اسی دم گوری پاشانے پانچ سو روپے گن دیے۔ دل رکھنے کو بولیں۔ ”تو
 دل چھوٹا نکو کر، ویسے تو گھٹائے میں نیٹیں رہیں گی۔ ذرا مریم پو اللہ کی نظر

ہونے لے۔ اتنے لوگ ان نیاز نذر لےنے کو آئیں گے کی تیرا گھر سونے چاندی سے بھر جائیگا۔ صغیرہ بیگم نے اپنی بیٹی کے واسطے جو کنیز اللہ کے نام پر پورے تھکے تیرے کو معلوم ہوئیں گا مجذوب ہو گئی تھی، بے ہوشی میں سچی سچی باتاں بولتی تھی تو کیسے اس کے سامنے لوگ ان نذر لےنے کو آتے تھے۔“ شمشاد بوا سن بیٹھی رہیں۔

مگر اب ان سے آنسو روکے نہ رک رہے تھے۔ کون ماں ایسی ہوگی جو نہ چاہے گی کہ اس کی اولاد کا گھر بے، سکھ چلن سے خوشی ہنسی وہ اپنی سسرال سدھارے۔ مرد کے ساتھ زندگی گزارے اور بال بچوں میں مگن ہے؟ یہاں تو پانچ سو میں ساری زندگی ہی تلپٹ ہو گئی۔ مریم کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی۔ گوری پاشاں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے محبت سے سمجھایا! ”دیکھ مریم تو زیادہ اس کمرے سے باہر نکو آیا جایا کر۔ تو اب بی بی بن گئی تیرے کو خود اپنی عزت کا خیال ہونا۔ چپ ادھر ادھر کھاگنا کھیلنا نہیں، بس نماز خزان پڑھ لیتے، بیٹھے رہنا۔“

مریم نے، جس کے کھانے کھیلنے، بھاگنے دوڑنے کے بھرپور تھے بے حد بے بس اور مظلوم نگاہوں سے گوری پاشا کو دیکھا اور سہم کر سر جھکالیا

عمر عزیز کے ۲۷ سال پورے کر لینے کے بعد اب حسن بانو میں رڑکی پن کی کوئی ادا باقی نہ رہ گئی تھی۔ گوری پاشا واقعی گوری تھیں۔ ماں باپ نے غلط نام نہیں رکھا تھا۔ مگر گوری پاشا نے جنے کیا سوچ کر بیٹیا کا نام حسن بانو رکھ دیا تھا۔ نام کی اچھی خاصی تہمت تھیں بیپاری۔ پھر کھلنے پینے

کی ریل پیل، نہ ماں باپ کی ڈانٹ ڈپٹ، نہ پڑھنے لکھنے کی پابندی۔ گوشت
کو جدھر حد صبر راستہ ملا بڑھتا چلا گیا۔ بیٹھتے بٹھتے تو لگتا تھا گوشت کا ایک
چھوٹا سا پہاڑ بیٹھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں ماں باپ کا کیا کرایا، اچھا ہو یا بُرا۔
اولاد کے آگے آتا ہے۔ یہ اللہ ہی کو معلوم کہ گوری پاشا اور بڑے نواب نے
کیا کیا تھا۔ مگر اللہ کے عتاب میں آئی تو حسن بانوی۔ ہزاروں روپے پیسے
کا لالچ بھی کسی کو پرچا نہ سکا۔ کتنے ہی دیکھنے والے آتے۔ آکے پھر جو جلتے
تو صورت ہی نہ بتاتے۔ ماں نے کیا کیا جتن نہ کر ڈالے۔ سہاگ کا جوٹا ان کے
جسم تک بھی نہ پہنچ پایا۔ مشاطہ سے ایک بار تو یہ تک گپی چپی ہو گئی کہ بھلے
سے ایک بار کسی اور لڑکی کو تبا دیں گے، ہاں تو ہو جائے۔ عین وقت پر
ڈولی میں حسن بانو کو سوار کر دیں گے۔ مگر کسی سیٹ پھوٹ کی وجہ سے یہ کھجلی بھی
کھل گئی۔ اب آخری حربہ گوری پاشا نے استعمال کر ڈالا۔ اس سے پہلے
ان کے اپنے خاندان میں اللہ کے نام پر تین کنواری لڑکیاں چھوڑی گئی تھیں
اور اللہ کی شان مری ماری مہم لڑکیاں بھی دلہنیں بن بن کر سسرالوں سدھار
گئیں، تو حسن بانو کے لئے دی گئی نذر اللہ کیسے نہ قبول کرتا؟ ابھی چند ہی دن
گزرے تھے کہ حمید آبادی کا ایک پیام آگیا۔ گوری پاشا کی جوانی ہی جیسے
لوٹ آئی۔ بارہ برس کی چھوکری کی طرح یہاں وہاں اچھلتی پھر رہی تھیں۔ مریم
کو ایک اور نیا جوڑا سلوا کر پہنا دیا۔ منہ چوم چوم کر اسے بتایا۔ ”دیکھ بی بی دل
لگا کو عبادت کیا کر۔“ اور اس کی ماں سے الگ بتایا۔ ”دیکھ شمشاد
حسن بانو کی شادی ہونے کے بعد بھی اسے اللہ کی باندی بنا کو چ رکھنا۔
نہیں تو میری بیٹی کو برے دن دیکھنا پڑیں گے۔“

پہلے لڑکے کی ماں بہن نے آکر لڑکی دیکھی۔ حالانکہ پسند نہیں کی۔ مگر پھر بھی واپس نہ گئیں بلکہ خط لکھ کر اپنے رشتے داروں سے بھی رائے پوچھوالی۔ جتنے دنوں میں خطوط کے جواب آئیں آئیں بیٹھی مرغن کھانے کھا کھا کر موٹی ہوتی رہیں۔ پھر ایک دن شکر مہنگا کر واپس چلی گئیں۔ ہاں کہا نہ ناں گوری پاشا کا سارا عتاب مریم پر نکلا۔ تو دل لگا کو عبادت نہیں کرتی جی بھی تو لوگاں آ کو پٹ گئیں۔ یاد رکھ جو کرے سے باہر نکلی۔

پہرا اور کڑا کر دیا گیا۔

کتنے ہی مہینے یوں نکل گئے اور مریم جوانی کی منزلیں سر کرتی گئی۔ ایک دن سخت گرمی سے بوکھلا کر مریم صحن میں نکل آئی۔ شام ہو رہی تھی۔ نہا کر اس نے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ موٹیے کا ایک گجرا کلائی پر لپیٹ لیا تھا۔ ایک دم صحن میں گوری پاشا نکل آئیں اور اسے دیکھتے ہی سن رہ گئیں۔ جوانی کیسی پھٹی پڑ رہی تھی! جو جوڑا انھوں نے پچھلے دنوں اسے سلوا کر پہنایا تھا۔ جگہ جگہ سے بکس گیا تھا۔ اللہ کی باندی کو گہنوں پاؤں سے کیا کام تھا؟ گہنوں سے سوئے اس کے ہاتھ پاؤں کیسے لس لس کر رہے تھے جسم میں گلا بیاں بھر گئی تھیں۔ نندا سی انھوں سے نہا کر اٹھنے کی وجہ سے سرمہ دھل گیا تھا۔ ایسی کوری صراحی کی طرح گردن اٹھا کر انھیں دیکھا کہ وہ لرز گئیں۔ آج صبح ہی سمشاد بولنے ڈرتے ڈرتے ان سے بتایا تھا کہ پرسوں گرمی کے مارے مریم صحن میں نکل آئی تھی۔ ان کے کسی رشتے دار کے بھتیجے نے اسے دیکھ لیا اور حالات سے بے خبر پیام بھونک دیا۔ تب سے گوری پاشا ڈری سہمی بھتیجے کہ کہیں مریم کے کانوں تک نہ پہنچ جائے کہ کوئی اس کا

خریدار بھی ہے! آئینہ تو اس کے کمرے میں تھا ہی نہیں، پانی بھی اسے کٹورے میں نہ پینے دیتیں کہ اس میں عکس دیکھ کر آگاہ نہ ہو جائے کہ کیسا زرگسی حسن پایا! کم و بیش اور دو سال گزر جانے کے معنی تھے کہ پچیس سال پورے ہونے میں حسن بانو کو صرف ایک سال باقی رہ گیا ہے اور مطلب یہ کہ ان ہی دنوں نے مریم کو قیامت بنا دیا ہے۔ اور اب تک اللہ نے نذر نہیں قبول کی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ مریم دل لگا کر عبادت نہیں کرتی۔

لیکن گوری پاشا کا خدشہ بے بنیاد تھا۔ اس لئے کہ مریم کی تو جہ کامرکز واقعی صرت خدا ہی تھا اور اس کا ثبوت یوں ملا کہ اس واقعے کے بعد پھر سے اچانک علی گڑھ سے ایک دھڑ دھڑاتا ہوا پیام ایسا آ گیا کہ خود نوشتہ میاں بھی ماں بہن کے ساتھ چلے آئے۔

ہوایہ کہ نواب صاحب کے جان پہچان والوں میں سے کسی کا علی گڑھ جانا ہوا۔ وہاں حسن بانو کا ذکر نکل آیا کہ بے حساب پیسہ ہے اور لڑکی۔ بس یہ کہ انسان کا بچہ ہے، کیا مضائقہ ہے اگر دیکھ ہی لیا جائے۔ حسن نہ سہی دولت ہی بے حساب سہی۔ گوری پاشا نے مہانوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا ایسی خاطر تواضع کی کہ غریبوں کو مات دیدی۔ روز دعوتیں روز دعوتیں۔ پھر اسی پر بس نہیں، مہان کو یہاں گھمانا، وہاں گھمانا، وہاں پھرانا۔ ایک دن چودہ ہوئی کا چاند آسمان پر کھلا ہوا تھا۔ گوری پاشا نے اپنے مہانوں کو خوش کرنے کے لئے گنڈی پیٹھ کا پروگرام بنایا۔ بڑے نواب صاحب کی فورڈ میں سب لہکر روانہ ہو گئے، سوائے ایک ظفر میاں کے، ان کا جی ٹھیک نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ ذرا تنہائی پسند تھے۔

رات بھگ چکی تھی۔ مارے اکتاہٹ کے وہ صحن میں نکل آئے، امی جان اور باجی کی منطق ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ انھیں ایم لے کا امتحان دینا تھا اور وہ ان کو یہاں گھسیٹ لائی تھیں پھر یہ کہ چارچہ دن ہو چکے تھے، قاعدے کے مطابق امی جان نے لڑکی بھی دیکھ ہی لی تھی۔ پھر پیام دیکر ہست نیت کر دیتیں۔ پتہ نہیں کیا سوچ بچار ہے؟ کدھر پھنس گیا میں بھی۔ مجھے بھی لڑکی کی ایک جھلک کسی پہلے دکھا دیں گی۔ تو وہ بھی نہ ہوا۔ بدکھوا تو خیر ہو گیا اور میں انھیں پسند آ بھی گیا۔ وہ خود ہی ہنس پڑے۔

یہ بدکھوا بھی عجیب چیز ہے۔ اور اگر میں انھیں پسند نہ آیا تو۔؟ انھوں نے صحن میں پڑا ہوا ایک چھوٹا سا کنکرا اٹھا کر یوں ہی ہوا میں اچھال دیا۔ صحن میں مہندی کی اوٹ میں مریم نے جاؤ نماز بچھا کر ابھی بھی نماز سے فراغت حاصل کی تھی۔ گرمیوں کی اسائی ہوئی رات تھی وہ کمرے کی گرمی سے گھبرا کر اکثر موتیا اور مہندی کی بارٹھ کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتی تھی۔ دعاؤں کے لئے اس نے اللہ کے حضور ہاتھوں کا پیالہ سا بنا رکھا تھا کہ مٹ سے وہ کنکرا اس کے ہاتھوں میں آگیا اس نے آگے کو سر جھکا کر دیکھا کہ کنکرا کیسے آیا؟۔ اسی دم ظفر میاں کی نظر بھی ادھر ہی اٹھ گئی۔ مریم نے بڑی حیرت سے انھیں دیکھا۔ کتنے سال تک ہو گئے تھے اس نے کسی مرد کی صورت نہ دیکھی تھی۔ اور اب دیکھی تو ظفر میاں کی، ساؤلا، سلونا مردانہ وجاہت سے بھرپور چہرہ ہلکی ہلکی مونچھیں، سادہ قمیض پاجامہ، اونچا قدر، وہ شاید بستر سے اٹھ کر چلے آئے تھے کہ بال بے ترقیبی سے ماتھے تک اتر آئے تھے۔ علی گڑھ کے ہے، پلے، بڑھے، پڑھے لکھے، ظفر میاں ایسی موم کی ناک تو تھے نہیں کہ

حسین چہرے کو دیکھتے اور یوں ہی چپ رہ جاتے، آگے بڑھے اور سرور ہو کر بولے ”آپ اتنی حسین ہیں کہ اصلی نہیں نقلی لگتی ہیں۔ تو پھر امی اور باجی نے دیر کیوں لگائی ہے؟ کیا میں یاد دنیا کا کوئی مرد آپ کو ناپسند کر سکتا ہے؟ بلکہ نعوذ باللہ آپ کو مسجدہ بھی کر سکتا ہے۔“

مریم اب بھر پور جوان تھی، سولہ سال کی عمر میں اس نے وہ رنگ روپ نکالا تھا کہ جو دیکھے بہہ جائے۔ نہ محنت نہ مشقت آرام کی کھانے اور روز روز کی صفائی اور غسل نے اس جوانی کو پھر پور راستہ دیا کہ بڑھتی چلی آ، اور جب جوانی جوانی کو دیکھتی ہے تو بغیر سمجھائے سب کچھ سمجھ جاتی ہے۔ مریم اب بچی نہ تھی اور یہ بھی سمجھتی تھی کہ اسے راہبہ کا درجہ کس نے اور کن حالات نے دیا ہے۔ وہ ذرا رکتے، جھجکتے بولی، ”آپ غلط نہ سمجھو، میں وہ نہیں جو آپ سمجھ لے رہیں۔ میں اللہ کے نام پر چھوڑی ہوئی کنیز ہوں، میں مریم ہوں اس ڈیوڑھی کی ماما کی لڑکی۔“

ظفر میاں حیدر آباد کی اس خبیث رسم سے واقفیت رکھتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ حالات کی ماری روئیں ہر کڑا ستم کس طرح اٹھانے پر مجبور ہیں۔ وہ بڑے دکھ سے بولے: ”مطلب یہ ہے کہ آپ پر خوشیوں کے سارے دروازے بند ہیں؟“

مریم نے سر جھکا دیا

وہ پھر بولے: ”اور آپ نے کبھی اس ظلم کے خلاف کوئی آواز بھی نہیں اٹھائی؟“

مریم نے آنکھیں اٹھا کر انھیں دیکھا۔ وہ سبز آنکھیں جو کابل مرے سے

بے نیاز تھیں۔ پھر بھی تلوار تھیں۔

مریم انہیں لبس دیکھتی رہی۔ کیا یہ آپ کے نام کی سزا ملی ہے کہ عمر بھر کنوار
 بن کا دکھ بھگتی رہیں۔“
 مریم کچھ بھی نہ بولی۔

”آپ کتنے سالوں سے اس عبادت گاہ میں بند ہیں جس کی قید اورنجریں
 آپ کے من، جوانی اور المہرین کے گرد حصار نہیں باندھ سکیں۔“
 مریم نے ایک لمبی سانس لے کر اپنی خوبصورت کا فوری انگلیاں ٹھاڑیں
 سات سال! میرے خدا، ظفرمیاں نے سر تھام لیا۔ اتنے سارے سالوں
 میں کبھی آپ نے چاند دیکھا؟ مریم نے انکار میں سر ہلایا
 ”کبھی آپ نے پھول دیکھے؟ کبھی آپ نے برسات کی پہلی بو بھار دیکھی
 جو پیاسی سے پیاسی دھرتی کو بھی سیراب کر دیتی ہے۔؟ کبھی ان آوارہ بادلوں
 کی آنکھ پھولی دیکھی جو دل میں سوئی ہوئی امنگوں کو جگاتے ہیں۔؟ جارتوں
 کی گرم صبحیں، گرمیوں کی خنک شاہیں۔ برسات کی کپکپا دینے والی راتیں
 یہ سب آپ کے دل پر سے ہو کر گزری ہونگی، لیکن آپ نے کبھی اپنے حق
 کے لئے کوشش کی۔؟“

”جی؟ مریم نے بڑے اچھے اور بھول پن سے پوچھا۔“ میں
 کیا کوشش کرتی؟ میں نمازیں پڑھ بیٹھ کر دعائیں مانگتی تھی کہ اللہ چھوٹی
 پاشا کے سہرے کے پھول لاں کھلا دے۔

ظفرمیاں اچانک آگے بڑھے۔ ”اور کبھی یہ سوچا کہ دوسروں کے
 پھول کھلاتے کھلاتے تمہارے اپنے چہرے کا یہ پھول ایک دن اپنی

تازگی کھو بیٹھے گا، اور انھوں نے اپنے ہاتھوں کے پیالے میں مریم کا پاکیزہ چہرہ تھام لیا۔

مریم سر سے پاؤں تک لرز کر پیچھے ہٹ گئی۔ خدا کے واسطے آپ میرے کو نکو چھوڑ۔ خدا ناراض ہو جائیں گا۔ آپ کو نیٹیں معلوم....

ظفر میاں تیز لہجے میں بولے۔ "کس خدا نے تمہیں یہ سزا دی ہے؟ اس ڈیوڑھی کے خداؤں نے! اوپر والے نے آج تک کسی کو ایسی بھیانک سزا نہیں دی۔ جانتی ہو مریم۔ مرد عورت ایک دوسرے کے لئے ہی بنائے گئے ہیں اور خدا نے یہ جوڑے بنائے ہیں۔ خدا جوڑے ملاتا ہے توڑتا نہیں تم.... تم شاید میرے لئے بنی تھیں۔"

مریم نے گھبرا کر اکیس دیکھا "آپ کو نیٹیں معلوم پاشا...."

"مجھے سب معلوم ہے مریم۔ میں سب جانتا ہوں اس چند دنوں کے مختصر قیام میں، میں اتنا کچھ جان گیا ہوں کہ شاید تم اتنے سارے سالوں کی زندگی میں نہیں جان سکی ہو گی۔ شمشاد بوا کو جانتی ہو انھوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ بھی کہ امی جان اور باجی بیس بیس میں ہیں۔ بے انداز دولت نے ان کی آنکھیں چکا چوند کر دی ہیں۔ اور یہ طے نہیں کر پار ہے ہیں کہ مجھ سے بڑی، جو شکل صورت میں بھی اچھی نہیں ایک لڑکی کے عوض یہ سودا قبول لینا دانش مندی ہو گی یا بے وقوفی۔" وہ رک کر بیٹھے، اور شمشاد بوا سے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ تم ان کی اکلوتی لڑکی ہو۔ مریم نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ "اور یہ بھی کہ اس وقت تم ان ہی کے کہنے پر ادھر ہندی کی اوٹ میں عبادت کر رہی تھیں اور یہ کہ اگر آج رات میں تمہیں یہاں سے لیکر چلا

جاؤں تو وہ باقی زندگی بڑے سکون کے ساتھ گزار سکیں گے۔“
مریم کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”میں تو ویسے بھی یہاں سے جانے ہی والا تھا لیکن شاید خدا نے
لکھ دیا تھا کہ میں تنہا نہ جاؤں۔“ وہ مریم کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش
میں اس کے قریب سرک آئے۔ ”مریم آج تک اس ڈیوڑھی کی ان مہیب
اور مولناک دیواروں نے تمہارا صبر ٹوٹا ہے، تمہیں منہ چڑھاتی آئی ہیں۔
آج حوصلہ کر کے تم یہ بلندیاں سر کر لو۔“

”مگر... م... میں نے پاشا کا نمک...“

نمک اور شکر کو مارو گولی، کوئی کسی کا دیا نہیں کھاتا۔ سب خدا
کا دیا کھاتے ہیں۔ تمہاری جہالت نے تمہیں اس قید میں ڈال رکھا ہے
تم میرے ساتھ علی گڑھ چلو۔ پہلے ہم شادی کریں گے۔ پھر میں تمہیں پڑھا
گا آں؟ انھوں نے بڑے پیار سے اس کی آنکھوں میں جھانکا، وہ آنکھیں
وہ کنواری اور معصوم آنکھیں۔ وہ پاکیزہ آنکھیں جو آج تک کسی مرد کی طرف
نہیں اٹھی تھیں۔

”اور ہمارے گئے پیچھے لوگاں جو باتاں بنائیں گے؟“ اس نے بید

ڈر کر پوچھا۔

”ظفر میاں منس دیئے۔“ باتیں بنانے والے کب باتیں نہیں بناتے
جان!“

سرخ سرخ بحری ان دونوں کے پیروں تلے بجنے لگی۔ اس کا

گلابی گلابی نرم گرم ہاتھ تھا مے وہ بڑھتے ہی گئے۔

جھوٹ

”حرام زادے، پاواں دیار یا کی مذاخ کر ریا رے؟“ بڑے سرکار
نے زور سے لات ماری اور کھوا ایک لڑھکنی کھا ڈور جاگرا۔

”ہاتھیں کادم کاسے سے چلا گیا؟ حرام خوردوں کو کیتا بھی کھلاؤ پلاؤ خون
میں جو مستی ہو رکام چوری کی عادت ہے سو ہے! اٹھ ذرا زور دے کو دبا۔“

کھوا اپنی مٹھی بھر ہڈیوں کو سمیٹتا، سہلانا اٹھا اور پھر ٹپے سرکار کے شاندار
بستر پر ڈرتا، سہمتا چڑھ گیا۔ آج اس کے ہاتھ پاؤں واقعی کام نہیں کر رہے تھے۔
اُسے اُن میں دم ہی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ پیٹ میں کچھ ہو تو انسان میں طاقت
بھی آئے۔ یہاں تو زندگی کا طور ہی نرالا تھا۔

ڈیڑھی کام کاج کرنے والوں سے بھری پڑتی تھی۔ ایک تو انا تیں تھیں
جو غریب، مگر شریف گھرانوں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لائی جاتی تھیں، تاکہ
نوں لود پاشا لوگوں کو دودھ پلائیں۔ اُن کی چاندی ہی چاندی تھی۔ بیگمات

بیمبوں کا سا، بلکہ اُن سے بھی بڑھ چڑھ کر کھانا بِلتا۔ تاکہ نئی نسل اچھی طرح پر دان چٹھے اونچوں کو دودھ کی کمی نہ لے۔

دوسرے درجے پر مائیں تھیں جو مِیلخ کی کرتا دھرتا تھیں۔ پہلے اُن ہی کے ہاتھوں سے ہو کر کھانا پاشا لوگوں تک پہنچا تھا۔ چکھتے پکتے ہی اتنا اڑا جاتیں کہ پیٹ بھر جاتا، اور جو یہ نہ ہوتا تو چڑا چڑو کر پیٹ بھر لیتیں۔

تیسرے نمبر پر اوپر کے کام کاج کی چھو کو یاں اور چھو کو سے، مالی اتمبوی چوکی دار اور چاؤش آتے تھے۔ جن کا کھانا ڈیوڑھی سے ہی ملتا تھا۔ انکا کھانا کھٹی دال، چاول، سبزی پر مشتمل ہوتا۔ بڑی سرکار کھانا بٹنے کے وقت خود آ کھڑی ہوتیں۔۔۔ وہ اچھے خالصے چچوں کو جن میں ذرا بھی گہرائی ہوتی، ٹھونک پیٹ کر سیدھا کرالیتی تھیں۔ کیوں کہ ڈونگے اور گہرے چچوں میں زیادہ سبزی اور دال چلی جاتی ہے، اور خواہ مخواہ اناج کی بربادی ہوتی ہے۔ اب یا تو آلٹے چمچ سے کھانا پر دسا جاتا یا ان ٹھونکے پٹے چچوں سے۔ ہر حال پیٹ تو سب کا پل ہی رہا تھا۔

اب چوتھے نمبر پر ساری مصیبت اُن اوپر کے کام کرنے والے چھو کو روں کی تھی جو مردانے میں محض ”سوکھے“ پر نوکرتھے۔ دور روپے کلداران کی خواہ ہوتی کھانا انہیں اپنے گھر پر جا کر کھانا پڑتا۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ ڈیوڑھی کے ہنگاموں میں چھٹی مل بھی نہ پاتی اور کام کرتے کرتے انہیں ایسی زور کی بھوک لگنے لگتی کہ آنتیں آلٹ آلٹ کر منہ کو آئے لگتیں اور گھر جا کر بھی کون سے ترتراتے، پر لٹے، پلاؤ اور میٹھے ان کے استقبال کو موجود ہوتے۔ وہی کھٹی دال اور موٹا چاول جو انہیں شاید صدیوں سے ورثے میں ملا ہوا تھا۔

کھوا اس لحاظ سے بڑا خوش نصیب تھا کہ بڑے سرکار کے منہ چڑھا ہوا تھا۔ منہ چڑھا ان معنوں میں کہ اُن کے بستر کاراز دار تھا۔ ایک سے ایک طرح دار چھو کری اُس نے لاکر بڑے سرکار کے بستر پر ”نون غنہ“ بنادی تھی۔ اور بڑے سرکار کو اس کی اس خوبی کا پتہ بھی نہ چلتا اگر ایک دن وُسے زنان خانے میں جا کر پان لانے کو نہ کہتے۔ اب پانڈان پر تو مشتری حکراں تھی، جسے چاہیے دے اور جسے چاہیے دھنکار دے۔ اور ایسی حرافہ کہ کچھ پوچھو نہیں۔ اس لئے کھوا لڑتے لڑتے کان کھجا کر بولا: ”پاشا، پان لانے کا آپ عہد کو بولونا۔“

”وہ کتے کو؟“ تو اب صاحب نے غصے سے کہا: ”تیرے ہاتھ ہندی میں پٹھے کیا؟“

اب کی بار کھوا کان اور سر دونوں کھجا کر بولا۔ ”نیتس پاشا ویسی بات نیتس۔ وہ مشتری ہے نا، اُنے.....“ وہ چپ رہ گیا۔

”کیا کرتی مشتری؟“ بڑے سرکار چوڑ کر بولے۔

”پاشا“ وہ منمنّا کر بولا ”وہ نمبر ایک کی چھال ہے۔ اُنے میرا ہاتھ لے کر اپنے سینے پر رکھ لیتی۔“ پھر وہ بڑے معصوم لہجے میں شرما کر بولا ”مٹو پاشا مولی صاحب بولے کی شریف مرداں بس اپنی بیوی کے سینے کو ہاتھ لگانا اُنے تو غیر ہوئی نا۔“

بڑے سرکار کو اس وقت نہ مولی صاحب سے غرض تھی نہ اُن کے دغط سے۔ اُن کے تھوڑ میں تو جھگڑاتی ہوتی مشتری گھوم رہی تھی جو اتنی بے باک تھی اور کم بخت زنان خانے میں چاکری کر رہی تھی۔

پھر کلدار ایک — پورا ایک روپیہ، یعنی آدھے مہینے کی تنخواہ پوری کھلا
کے ہاتھ میں آگئی — یعنی تنخواہ کے علاوہ تنخواہ! بدلے میں وہ مشتری کو پٹا
کر مردانے تک رات کے اندھیرے میں لے آیا اور رات کے اندھیرے میں ہی
تو چاند جگمگاتا ہے۔

بس اس کے بعد تو یہ معمول ہو گیا کہ کھلا بڑے سرکار کا مشیر خاص بن
گیا۔ خانہ باغ سے لیکر، معظم جاہی مارکیٹ سے لے کر، چار منار کے اطراف سے
لے کر، کوٹلہ عالیجاہ سے لے کر، میر عالم کی منڈی سے لے کر، پنچھی بٹاق سے لے کر
محبوب کی ہندی تک، کوئی جگہ ایسی نہ بھی جہاں کے پھیرے اس نے نہ مائے
ہوں اور بڑے سرکار کی خدمت اقدس میں ہر رات ایک نیا چاند طلوع
نہ کر دیا ہو۔

دقت اور بیوپار سلیقہ بھی سکھا دیتے ہیں۔ اب وہ محض ایک روپے
کے عوض ایک چاند سپلائی نہ کرتا۔ کسی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے
بلا دیتے تو دوسے لے کر پانچ روپے تک بھی بنا لیتے۔ کبھی دس تک بھی نوبت
پہنچی، کبھی کبھار اس سے بھی زیادہ۔ لیکن رہا وہی ڈیوڑھی کا ”باہر کا پوٹا“ سا۔
پیسہ وہ اضلاع میں رہنے والے مال باپ کو بھجوا دیتا، جن کی جھڑسی زمین مستقل
قرضوں میں چھسی ہوئی تھی۔ کھانا کھانا کا ابھی تک اس کے ذاتی گھر میں ہی ہوتا۔
جہاں اس کی بیوی کھٹی دال، موٹا چاول پکا کر اس کا راستہ دیکھتی ہوتی۔ لیکن
بڑے سرکار کا مشیر خاص بننے کا ایک فائدہ ضرور ہوا تھا۔ آسے دن اسے رات
کے کھانے میں بھی ہوتی انواع و اقسام کی نعمتوں سے بھرا طشت یوں ہی مل جاتا
بڑے سرکار تھے دل والے۔ شراب، کباب اڑانے کے بعد ویسے بھی انسان

کو سستی بھوک باقی رہ جاتی ہے۔۔۔ جنت کی سی نعمتوں سے بھرا طشت خاص
انخاص بڑے سرکار کے کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا کیونکہ نشے کے مارے ان کے
لئے اپنے آپ چلنا بھی دُوبھر ہو جاتا۔ یوں ہی تھوڑا بہت ٹونگ کر کھلانے والے
خادم سے کہتے "طشت والیں نکولے جاؤ۔ انے کلو ابیٹھا ہے باہر، اس کو دے لے۔
یہ جھوٹن اس کا اپج حصہ ہے۔"

کھلانے والا خادم اس عنایت پر جل بھن کر خاک ہو جاتا اور اپنے جی
کی جلن مٹانے کے لئے باہر بیٹھے ہوئے کلو اسے پکار کر کہتا۔ "یہ لے جھوٹن کھا
کو برتن خالی کر کو جلدی سے دے دے میرے کو۔" وہ جھوٹن پر زیادہ زور
دیتا۔ لیکن نعمتوں سے بھرے ہوئے خوان اسی صورت میں کلو کو
ملتے تھے جب بڑے سرکار کہیں مدعو نہ ہوتے، جس دن وہ کہیں دعوت میں تشریف
لے جاتے یا جس دن اُن کی طبیعت سست ہوتی اور وہ زنان خانے میں کھلوا
دیتے کی آج کھانا نہ بھجوا یا جاتے تو کلو کی میٹ اٹھ جاتی۔ دن بھر کا بھوکا،
پیا سا، نہ ہاتھوں میں دم نہ انگلیوں میں جان بس یوں ہی ہل ہل کر برائے
نام پاؤں دبائے جاتا، اس طرح کہ بڑے سرکار کے پیروں پر تو کم وزن پڑتا
اور کلو خود اپنے جسم کو زیادہ جھکولے دیتا رہتا اور اسی جھکولے میں غصے سے
بھرے ہوئے سرکار کی ایک آدھ لات ایسی کراری پڑتی کہ کلو مہری سے دھپ
سے نیچے جا پڑتا، دوبارہ اپنے آپ کو سمیٹا اور پاستتی پر چڑھ جاتا۔

ایسی ہی لات اُس کے آج پڑی تھی، مگر آج جو سرکار نے اُس کے لات
ماری تو اس میں پاؤں اچھی طرح نہ دبانے کی سزا کم اور کوئی اچھی سی لڑکی نہ ڈھونڈ
نے کی سزا زیادہ تھی۔ اتنے دنوں سے مسلسل یہ ہو رہا تھا کہ روز ایک نئی لڑکی

آتی۔ مگر اتنی بہت سی نئی لڑکیاں آخر آئیں کہاں سے؟ حیدر آباد دکن کا ایک بڑا مشہور بٹری ترکاری کا بازار تھا، جسے عرف عام میں "میر عالم کی منڈی" کہتے تھے۔ لڑکیوں کی بھی ایسی ہی کوئی منڈی ہوتی تو کیا بات تھی۔ بس گئے، پیسے دے اور بیل گاڑی بھر لڑکیاں تلو کر لے آئے۔ لیکن لڑکیاں تو جناب ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر چیلے بہانوں سے، روپے، پیسوں کا لالچ دے کر ہی لائی جاسکتی تھیں اور وہ بھی ایسی صورت میں جب ان کا وجود ہوا جتنے پتے ٹھکانے معلوم تھے، وہاں کی خوب صورتیاں بستر کی زینت بنائی جا چکی تھیں۔ اور ادھر نواب صاحب کا جسم ٹوٹا جا رہا تھا۔ ناگنوں سے ڈسوانے کی ایسی لت لگ چکی تھی کہ گھر کی بیوی اب ٹھس ٹھس معلوم ہونے لگی تھی، ویسے بھی وہ اس طرح سوچتے تھے:۔

"دنیا کا انے عجیب غریب دستور ہے۔ کپڑا پڑانا ہوتا، دل سے اترتا، آپ کسی کو بھی دیدیتے۔ کوئی کچھ نہیں بولتا، جوتی پڑانی ہو گئی، آپ پھینک دیتے یا دوسری خرید لیتے۔ کوئی کچھ نہیں بولتا۔ ایچ کھانا کھاتے کھاتے آپ کا دل بھر جاتا، آپ بول کو دوسری ہانڈی بچو اکیر کھا لیتے۔ کوئی کچھ نہیں بولتا۔ ہو تو ہوور میں سال کے سال ہاتھ کی گھڑی بدل دیتا۔ کوئی کچھ نہیں بولتا۔ پن آپ ذرا بیوی سے اکتا جاتے ہو پھر کبھی باندی سے دل بہلانا چاہتے تو ساری دنیا ناماں رکھتی۔ یہ دنیا بڑی عجیب و غریب ہے۔" اور اس عجیب و غریب دنیا کا چلن بدلنے اور نئی ریت قائم کرنے کے لئے ہی وہ روز ایک نئی تبدیلی کے خواہاں تھے اور آج کے غصہ کی وجہ ہی یہ تھی کہ سرکار کا حکم تھا کوئی نوی چیز ہونا۔ پاؤں ذرا سیٹ کر نواب صاحب تے ذرا نرمی سے پھرتا بات شروع کی۔

"ہوئے تو روپے پیسے کے مارے تو پیچھے نہیں ہٹا ریا۔"

اونگھتا ہوا کھوا ایک دم چوکنا ہو گیا۔ وہ کاروبار میں منہ چکا تھا، سمجھ گیا۔ چوٹ لگنے کا وقت اور موقع یہی ہے۔ بظاہر بے پروائی سے بولا: ”جی ہو پاشا، آپ سچی سمجھے۔ مگر میں آپ سے اس واسطے نہیں بولا کی آپ نہیں تو سمجھتے کی میں اچ خرد برد کر رہا۔“ پھر ذرا رک کر کہنے لگا: ”پاشا اس کی ماں بچیں روپے کلدار مانگ رہی تھی۔“

بڑے سرکار ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ”بچیں روپے؟ ایسی کون سی کوہ خاف کی پری ہے اُنے۔“

کھوا پر جانے کے انداز سے بولا: ”جی ہو پاشا۔ کوہ خاف کی پری ہے اُنے نہیں پری ویسی نکلی تو کلیم الدین سے پلٹ کر میرا نام کھوار کھ دینا۔“ پھر ذرا آگے جھک کر ادھر ادھر دیکھ کر بے حد راز داری سے بولا: ”پاشا— کبھی لال مٹی کا کورا برتن دیکھے آپ؟ پانی پڑتے اچ کیسا سن سے بولتا! بس ایسا چ کورا برتن سمجھ لیو پاشا— سن، سن۔“

کچھ ایسے انداز سے کم نجت نے نقشہ کھینچا۔ بڑے سرکار کی رگ رگ سن سن کرنے لگی۔ تڑپ کر کھڑے ہو گئے، اچکن کی جیب سے کھن کھن گین کر بچیں۔ روپے نکلے اور کھوا کی طرف اچھال کر بولے: ”جا کو بس ابی ابی لے کو آجا وہ چو کر ی کو—“

کھوار روپے دونوں مٹھیوں میں دبا کر تیزی سے نیکلا اور برق رفتاری سے بھاگتا ہوا اپنے گھر پہنچ گیا۔

”سکوٹ— اگے ادسکو! کان مر گئی؟“ حواس باختہ سکینہ سامنے کے دالان میں نکل آئی۔ ”کائے کو اتا چلاتے رہیں۔“

”کئے کھانا کھائیں گی؟ مرغ، بریانی، ڈبل کا میٹھا، دہی کی چٹنی، کشمش

دلے نان“

”چچ، چچ، چچ“ سکینہ انسوس سے بولی۔

”بھوک کے مارے سچ سچ بھی تمہے پاگل دیوانے بن گئے۔ پن میں بھی

کیا کردوں؟ آج تو دال چادل کو بھی پیسے نہیں تھے۔ فافہ ارج سمجھو۔“

”اگے فافہ نہیں۔۔۔ دعوت بول، دعوت۔ دیکھ یہ روپے۔“ اور اس

نے روپے دالان میں اچھال دیئے۔

سکینہ پاگلوں کی طرح روپیوں پر لپکنے لگی۔ ایک دم کلو اسے دونوں

ہاتھوں میں سنبھال کر کہنے لگا۔ ”بس پہلے ایک چھوٹا سا کام کر دے میرا۔ پھر یہ

سارے روپے اپنے سال بھر کو پوسے پڑ جاتے اتنے تو۔

”کیا کام ہے؟ جلدی بولوتا۔“ سکینہ خوشی سے پاگل ہوتے ہوئے بولی۔

کلوانے محراب میں ٹھونسے ہوئے کپڑوں میں جھٹ سے ایک ٹمل کا سفید

کرتا نکالا اور اپنے ہاتھوں سے ہی سکینہ کے جسم پر سے میلا کرتا گھسبٹ کر

اتنا نا شروع کر دیا۔ وہ چلائی بھی، ”اگے اگے! یہ کیا کرتے جی تمہے؟ بے شرم

کدھر کے۔ کیا میرے کو کپڑا پہنا نہیں آتا؟“ لیکن اتنی دیر میں کلو اس کا کرتا اتنا

قدرت کی صنائی کی داد دینے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

”سکو۔۔۔ تو مال ہے! سچی تو مال ہے! تو بچیں روپے کچھ لایا ہے۔

چل جلدی کر۔“

پھر اس نے مبہوت کھڑی سکو کو اپنے ہی ہاتھوں کرتا پہنایا دوپٹہ

اڑھایا اور ٹھسٹیا ہوالے چلا۔

بڑے سرکار کی جو نظر اٹھی تو اٹھی ہی رہ گئی۔۔۔ غریبی جب ٹمل کا

کرتا کسی غریب کو پہنا دیتی ہے تو نوابوں کو بھکاری بنا دیتی ہے۔ بڑے سرکار
ایک بھکاری کی طرح اُسے تکتے جا رہے تھے۔ گریبان تک جو ٹن پٹی لگی
ہوتی تھی اس میں ہلکی سی گھٹ کی زنجیروں میں بجنے والے ٹن جگمگا رہے تھے۔
اور زنجیر اور ٹن کے دانتیں اور باتیں گلابی کٹوریوں میں جیسے پھر بھری رکھی تھی،
جسے جاتے کیلئے بڑے سرکار بے قرار ہوئے جا رہے تھے۔ انہوں نے فاتحہ زوروں
کے انداز سے کلو اُسے مڑ کر کہا ”پچیس روپے تو بہت بی بہت کم بولا تھا
رے تو۔۔۔ پچیس روپے تو فقط اس پوسے وار کو پھینک دینا۔“

روتی دھوتی سکینہ باہر نکلی تو کلواد میں جھاڑیوں میں ڈبکا بیٹھا تھا اُسے
دیکھ کر وہ تیزی سے اٹھا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے بھگاتے ہوئے ڈیوڑھی
سے باہر لے آیا۔ ایک ہاتھ سے رکشا روک کر اُس نے نامیٹلی اسٹیشن کے ایک
بڑے سے ہوٹل کا پتہ دیا جو رات گئے تک کھلا رہتا تھا۔

گھر سی پر بیٹھے ہی اس نے مرغ، بریانی، میٹھے، دہی کی چٹنی، نان ایک
سے ایک بڑھیا چیز کا آرڈر دے ڈالا۔ پیرا ایک ایک چیز لا کر چنتا گیا۔ اب پہلی
بار اُس نے نظرس چمرا کر سکینہ کی طرف دیکھا۔

”روبنے کو تو ساری رات پڑی ہے، بلکہ ساری زندگی پڑی ہے گے۔“

ذرا سن پہلے پیٹ بھر کو کھانا تو کھالے۔ تیری اچ تو کمائی ہے۔“

سکینہ نے پہلے تو اپنے شوہر کی طرف دیکھا، پھر پاس پڑا ہوا چمچ اٹھا کر
تڑا تو زور زد سے اس کے سر پر مارنا شروع کیا۔

”اگے اگے۔۔۔ یہ کیا کرتی گے؟ اگے دیکھنا تو کب سے مرغ کی

فوشبو بھی نہیں سونگھی ہو تین گئی۔ بریانی کا مزہ کیسا ہوتا، یہ بھی ترے کو یاد نہیں

ریا ہوتیں گا۔۔۔ پر اب دیکھنا، دیکھ، دیکھ! کیسا بہت سا کتا مرے دار کھانا ہے۔ تو بھی تو صبر سے بھوک کی اِچ تھی نا؟“

چچہ چوڑ کر سکیں نہ کھانے کی طرف دیکھا اور اس کی بھوک اُسے ڈسنے لگی۔ اُس نے دیوانوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے مونہہ میں بیک وقت کئی کئی چیزیں ٹوٹنی شروع کر دیں۔

کلو اکا پر وگرام سوچا سمجھا تھا۔ سال بھر کی تنخواہ ایک ہی ساتھ مل گئی تھی بیوی کی عزت گئی اس کا اُسے دکھ ضرور تھا۔ لیکن سوکھے پیٹ نے اُسے جواز بھی سمجھا دیا تھا۔

”اتنے زمانے سے میرے ساتھ سوتی تھی۔ بس ایک رات بٹسے سرکار کے ساتھ سو گئی تو کون ہیرے موتی جھڑ گئے۔۔۔ بات تو ایک اچ ہوئی نا! سرکار کے ساتھ سونے سے کم سے کم سال بھر کی تنخواہ ایک ساتھ تو مل گئی!“

اب اُس نے یہ سوچا تھا کہ چپکے سے نکل کر سکیں نہ کو ساتھ لے کر ماں باپ کے پاس اضلاع میں چلا جائے گا اور باقی زندگی کھیتی کے کام کاج میں چین بھر بغیر تنے گڈلے گا۔ روز روز کی لائیں اب اُس سے برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔

دو دن تیاری میں نکل گئے۔ ان دونوں میں وہ ڈیوڑھی ہی نہیں گیا۔ اور جلنے کی اب ضرورت بھی کیا تھی؟ اپنے حسابوں تو اُس نے نوکری چھوڑ دی تھی۔ لیکن ادھر نواب صاحب کو پہلی دھار کی طرح چڑھ گئی تھی ڈیوڑھی اتنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ دو دن تو اسی انتظار میں نکل گئے کہ کلو اُسے تو پھر اسی کوری لال مٹی کی صراحی کو بلوائیں، مگر جب کلو اُپٹا ہی نہیں تو

بڑے سرکار خود ہی شکرم لگوا کر اُس کے گھر پہنچ گئے۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ دو دن سے کلو نہیں آیا، تو وہ خیریت پوچھنے آئے ہیں۔

کلو اُس وقت کسی کام سے بازار گیا ہوا تھا۔ گھر میں صرف سکینہ تھی، نواب اقتدار یار جنگ کا کلو ایسے حقیر فقیر کی مڑگی (دھونپڑی) تک آجانا ایسی کوئی معمولی بات تو تھی نہیں، سارے محلے میں شور مچ گیا۔

”اگے ایک بہوت بی بہوت خوبصورت بڑی بھاری شکرم آئی گے کوئی نواب صاحب آئے کتے۔“

سکینہ بھی تیسری سے باہر نکلی۔ نواب صاحب سے اُس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ نواب صاحب کا دل اچھل کر سینے سے باہر نکلنے لگا۔ جس کے لئے وہ یوں تڑپ رہے تھے وہ اس قدر آسانی سے مل جائے گی، اس کا آپہنیں گمان بھی نہ تھا۔ مگر رعب داب قائم رکھنے کی خاطر پوچھا ”کلو کا گھر کون سا ہے؟“

”یہی راج ہے سرکار۔“ کئی آدمی ایک ساتھ بولے۔

”تو اُس کے گھر یہ چھو کری کون کھڑی؟“

”یہ؟“ انے تو اس کی مکان والی (دیوی) ہوتی سرکار۔“

نواب صاحب کبھی سکینہ کو دیکھتے، کبھی محلے والوں کو۔ دل میں غصہ کا آبل سا اٹھا۔ تو اُنے حرام زادہ، سور کا جناہم کو دھوکا دیا۔ پورے پچیس روپے کا دھوکا۔ ”اچھا بچہ جی“۔ وہ سکینہ سے مخاطب ہو کر بولے۔

”یہ ہمارا چاؤس تمہارے گھر پو بیٹھا ہے گا۔ کلو آئے تو اُس کو فوراً ڈیوڑھی بوجھ دیجو۔“

کلو ابید مجنور کی طرح کانپ رہا تھا۔ جب زپازپ بید پر بید پڑا ہے

ہوں تو اچھے لیچے بھی بید مجنوں کی طرح کانپنے لگتے ہیں اور وہ تو تھا ہی قمیجی کی طرح۔

”کیوں بے حرام کی اولاد۔۔۔ جب اپنے گھر کی آپس کی اچ بات تھی تو تو میرے سے روپے کیوں لیا؟ اتنی خوبصورت تیری بیوی تھی تو تیرا کام نہیں تھا کی ویسا چ لا کو پیش کر دیتا۔ کیا میرا نمک نہیں کھاتا تھا تو؟“

کلوا کچھ نہ بولا۔

”اب تیری سنا یہ ہے کہ وہ پورے روپے میرے کو واپس کر۔ ہو رہا سنا کے طور پر ایک مہینہ روزانہ اپنی بیوی کو میرے پاس بھجوا۔“

کلوا کچھ نہ بولا۔

”ہو رہا سن۔۔۔ تیری ایک سنا یہ بھی ہے کہ جب ہم ہو رہی تیری جو رواندر رہیں تو تو دروازے پر ہی بیٹھا رہو۔۔۔ پھر تیرا جی تو جلنا کی اندر تیری جوڑ کا کیا حشر ہو رہا۔“

کلوا کچھ نہ بولا۔

پھر سرکار کھانا کھلانے والے خادم کو بلا کر زوردار الفاظ میں تنبیہ کی:

”اب سے ہماری جھوٹن اس حرام زادے کو نگو دیتے جاؤ۔ بہت حرام خور ہے اسے۔ کھا کھا کو مستی چڑھ گئی اس کو۔“

خوف کی زیادتی کبھی کبھار انسان کو بے خوف بنا دیتی ہے۔ اب کلوا پہلی بار بولا:۔۔۔ ”ہو، آج سے میں اچ کا۔ کی جھوٹن نہیں کھاؤں گا۔“

کیوں کہ اب تو سرکار میری جھوٹن کھا رہے۔“

بڑے سرکار کے ہاتھ سے بید چھوٹ کر ان کے اپنے پیروں پر آ پڑا۔

ٹھکانا

”پاشا“ میں بہوت پریشان ہو کہ یہ فون کر رہی۔ ”صنوبر کی کانپتی آواز دور سے سنائی دی۔“ آپ کی بلی صبح سے کچھ کھا پی نہیں رہی۔“ اس نے اٹکتے اٹکتے بات پوری کی۔

”اللہ میں مر گیا!“ رضیہ بانو، نواب اقتدار جنگ کی اکلوتی لڑکی۔ کاذونٹ کی پڑھی ہوئی۔ جسے حیدر آباد کے عام امراء کی لڑکیوں کی طرح لڑکوں کے انداز میں بات کرنیکا کٹریر تھا، فون میں منہ کھٹیر کر تقریباً چلاتی ہوئی ہوتی ہو تم لوگ کیا پانواں میں ہندی لگائے کو بیٹھیں کیا پیتا کو بول کے ڈاکٹر کو ذرا فون کر دیو۔“ پھر وہ ماڈتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر پیچھے مڑی اور اپنی عزت نیاز جان سہیلی روشن سے رو نکھی ہو کر بولی۔ ”اللہ روشن، نیکی کو کچھ ہو ہوا گیا تو میں

میں مریاؤں گا۔“

اللہ نگریزی اہل پریشان نکو ہو۔“ روشن آرا (وہ بیک وقت حالہ کی بیٹی بھی تھی) وہ سہیلی بھی، اور دونوں ہی کو کالونٹ میں پھنسا کر بات بات میں انگریزی بولنے اور ناموں کو ”انگریزیت“ میں ڈھالنے کا شوق تھا، رضیہ کو ریزی اور روشن آرا کو روشی کہلاوانے کا ضبط فون کے پاس آکر بولی۔“ تو بولنا پاپا سے لائن ملا دیو۔“

”نیٹس اللہ روشی! تو نیٹس سمجھتی، پاپا سے فون ملانا خیامت سے خیانت۔ انوں لیکچر شروع کر دیں گے۔ صبح ناشتے میں کیا کھائے؟ دوپہر میں کیا پیئے؟ سہ پہر کو شوٹے کہ نیٹس؟ چار بجے کہیں چائے تو نہیں پی لیتے؟ غصا کرتی ہے۔ نکو بابا، ایک جھنجٹ ہے کوئی۔ پھر وہ چونک کر فون کی طرف دوبارہ متوجہ ہو گئی۔ ”اللہ صنوبر، میں خود آتا ہوں۔“

اچانک بلی کے دودھ نہ پینے سے پکنک والے پروگرام کا کیسا سخت استیاء ہوا تھا! لیکن کیا کہا جاسکتا تھا؟ بلی آخر رضیہ بانو کی بلی تھی، روشن آرا بھی مجبور تھی۔ دودھ سے رضیہ بانو اپنی خالہ کی حویلی میں محض ہلر بازی بچانے آئی ہوئی تھیں۔ کیونکہ چند روز بعد تو ان کی شادی ہونے والی تھی، پھر یہ فراغت کے دن مات کہاں نصیب ہونے والے تھے۔ پھر تو وہ خالص ”بیگمات“ بن جانے والی تھیں،۔۔۔ بڑے تخت پر شان دار تخت پوش بچھا ہوا۔ سامنے سونے کا پاندان، تخت سے نیچے چاندی کی سلفی، اگال لان، پان بنا کر نواب صاحب کو دے رہی ہیں۔ خود کھا رہی ہیں، حویلی کے بارے میں احکامات صادر کر رہی ہیں۔ اقوام شادی کے بعد کس قدر ذمہ داریاں گئے پڑ جاتی ہیں۔ آٹھ دن کی دھو تیرا ہنڈ

کرد۔ پھر اپنے گھر پر ہونے والی دعوتوں کے سلسلے میں حیف بھول کر بار بار
 رشتے نکال کر دو۔ کاموں کی انتہا ہے کوئی! ایسی ذمہ دارانہ زندگی اپنانے
 سے پہلے چند دن ساتھ کی ہم عمر سبھی سہیلیوں میں کھیل کود کر گزار لئے جائیں،
 تو کیا ہی اچھی بات ہے۔ لیکن قسمت میں ہو تب نا۔ ورنہ یہ بیٹھے بٹھے
 جلتی کیوں بیمار پڑ جاتی۔؟

پرے لگی ہوئی سیاہ فورڈ میں سے دونوں سہیلیاں حنا سے باختم آئیں
 اور سیدھی زنان خانے کی طرف لپکیں۔ اب پیا حنا سے ملا خات کرنا کتنی
 ضروری جگہ تھی، لیکن جلتی۔!

چاندی کی پلنگڑی پر اعلیٰ گلابی قسم کے مخملیں شٹائل کے گدے پر بچی سست
 پڑی تھی۔ بالوں دار لمبی دم پیٹ کے نیچے دبائے ہوئے، مالکن کے پیروں
 کی چاپ اور مانوس خوشبو سونگھ کر اس نے بڑی اداسے پزاری سے ذرا کی ذرا سر
 ہلایا۔ اور گلے میں پڑے ہوئے سونے کے گھنگھرو مدھم سروں میں چھن چھنا
 "اللہ کیا ہو گیا جی میری جان کو" رضیہ بانو نے بیک کر روٹیں دار جلتی کو،
 بازوؤں میں دبوچ لیا۔ ننھی پاشل کے غم میں پوری ڈیوڑھی شریک ہونا چاہتی تھی
 اسی مارے ان کے پیچھے ایک جم غفیر اکٹرا ہوا تھا۔

"پاڈاکٹر کو فون کرے کی نہیں؟" اس نے گھوم کر جلد حاضرین سے ایک
 سوال کیا۔

"ایک موٹر لکے کی آواز آئی تھی۔ شاید ڈاکٹر صاحب راج ہوئیں گے
 پن پرے کی وجہ سے شاید ادھر چ بیٹھے ہوئے ہیں گے۔"

”پرے جھڑکے کو مارو گولی جی! جلدی سے بلا کو لاؤ.....“
 لیکن اسی دم لکھنؤ والی نفیس باورچن ’جو ڈیوڑھی میں محض ایک بریانی پکاتے
 پر مامور تھیں، قدرے الجھ کر بولیں ’اے موئے ڈاکٹر کیا کریں گے بھئی، وہ ہم بریانی
 کے لئے گوشت لئے بیٹھے تھے کہ پنکی بیگم آگئیں اور اتنا نہ اتنا پورا پکی تول سے
 تین پاؤ گوشت کھا گئیں۔ اب اتنا کچھ کھالیا تو سست نہ پڑیں گی تو
 کیا ناچتی پھریں گی۔؟“

رضیہ بانو کا موڈ بُری طرح آٹ ہو گیا۔ جھلا کر بولیں: ”تو ماما، تم نے ہماری
 بی کو بکرے کا گوشت کھلا ڈالے، تم کو اتنا بھی نیٹس معاہدہ کی اُنے روزانہ ایک مرغی
 کھاتی ہے۔ وہ تو میں بھی سوچ رہا تھا کہ اُنے کاٹے سے ایسے سست ہو گئی۔“

”یہ حیدر آباد دکن ہے، پیارے مسعود

یہ نوابوں، رئیس زادوں، کی بستی ہے۔ یہاں یا تو انتہائی امیر لوگ بسے ہوئے
 ہیں، یا انتہائی غریب، بلندیوں اور پستیوں کا ایسا عجیب غریب امتزاج میں نے
 کہیں اور نہیں دیکھا۔ ہم دگ بھی یہاں کے امراء اور رؤسا میں شمار کئے جاتے
 ہیں۔ دہلی سے آکر ہم دگ بھیں کے ہو گئے ہیں۔ یہاں آکر ہمیں سب کچھ مل
 گیا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں کھوٹے کھوٹے پن کا احساس جی کو ڈستار تھا ہے
 ابامیاں حصور نظام کے دربار میں اتنی بڑی جائداد پر مامور کئے گئے ہیں کہ کہنے
 والے کہتے ہیں کہ پھاوڑے اور کدایاں لگا کر بھی ہم یہ دولت کھنکوانا چاہیں تو نہیں
 کھنکوا پائیں گے۔ ہاں اب ہمارے یہاں کے چھوٹے بچوں کی تعلیم مزرے میں
 ہو رہی ہے۔ کانوٹ میں انگلش ٹیچر سے پڑھتے ہیں۔ گھر پر استانی ماں اردو

سکھاتی ہیں۔ اور جغرافیہ تاریخ، حساب الگ سے پڑھاتی ہیں۔ مولوی صاحب
مذہبی تعلیم کے لئے رکھے گئے ہیں۔۔۔۔۔

مگر یار یہ برسوں بعد تمہیں میرا خیال کیسے آگیا اور میرا حال پوچھنے کی ضرورت
کیسے پڑ گئی۔؟

شادی؟ ہاں وہ جلد ہی ہونے والی ہے۔ یہاں ابامیاں کے گھر سے
دوستوں میں سے ایک نواب اقتدار جنگ ہیں۔ ان کی ایک ہی صاحبزادی ہیں۔
سنا ہے (دیکھا نہیں) بڑی ہی خوبصورت اور فارورڈ ہیں۔ ایک آدمہ جھلک
دیکھ لینے کا (شادی سے پہلے) ارادہ ضرور ہے، کیونکہ یار سنا ہے کہ یہاں کی
نواب زادیاں بڑی خوبصورت ہیں، مگر نمک چڑھی بھی ہوتی ہیں۔ اگر صورت سے
ایسا ویسا کچھ اندازہ ہو گیا تو میں کسی نہ کسی بہانے گول کر جاؤں گا۔ لیکن اصل مصیبت
یہ ہے کہ دست کہ نواب اقتدار جنگ کے ہاں اس قدر شدید پردہ ہے کہ تم اندازہ
بھی نہیں لگا سکتے۔ موٹروں میں موٹے موٹے ریشمی پوشے لگے ہوئے ہیں۔ امی
جان نے بڑکی۔ میرا مطلب ہے رضیہ بانو کو ایک محفل میں دیکھا، پسند کیا اور
میرے لئے چن لیا۔ میں تو خیر میں ہی ہوں، حد یہ ہے کہ ابامیاں بھی ہونے والی
ہوں کہ نہیں دیکھ سکتے۔ سات پردوں میں رہنے والی رورتی شہزادی سے گویا ہماری
شادی ہو رہی ہے۔

بہر حال تم شادی میں ضرور شامل ہونا،۔۔۔ رقعے تول ہی جائیں گے لیکن
میری طرف سے تمہیں ذاتی طور پر خصوصی دعوت۔

اے ماں، میں نے شائد تمہیں نہیں بتایا کہ میں نے اکنا کس میں ایم اے
کر لیا ہے۔ اور یار مسعود، تم آج کل کیا کر رہے ہو۔ کبھی تو دہلی سے باہر نکلو

شادی کے دعوتی رقعے کا انتظار کرو۔

تمہارا فیروز

کیا ہی یادگار شادی تھی، کچھ پوچھتے نہیں۔ نواب اقتدار جنگ نے کہ روپیہ، جن کے ہاں پانی سے بھی گیا گزرا تھا، اس شادی میں ایک اور ہی مدت تھی۔ مہمانوں کے لئے جو مہمان خانے اور گھر سجاائے ملتے ہیں۔ نواب کے سے انمول لئے یہ کیا کہ ہر مہمان خانے میں ایک ایک حسین ترین رقصہ کا بھی انتظام کیا۔ رقصہ جو ناچے بھی، گائے بھی اور رات پڑنے پر سچ بھی سجاائے اب بھی ظاہر ہے کہ سب ہی مہمان تو کنوارے نہیں تھے۔ کئی بال بچوں، بیویوں والے بھی تھے۔ ایسی دھواں دھول مچی کہ بس، اب کون اُتو کا پٹھا تھا کہ تر نوالہ سامنے دیکھے اور منہ پھیر لے۔ اور کئی بیویوں نے اپنے شوہروں سے ناراض خطی لے لی اور کئی نوابوں نے تو اپنی بیگمات کو کھڑے کھڑے تین طلاقیں دے دیں۔ اور ان ہی رقصہ صاوں کو گھر ڈال دیا۔ ایک محتاط انداز سے کے مطابق اس شادی کے انتظام پر کوئی نوے لاکھ روپیہ اٹھا تھا۔ ستر تو رقصہ صائیں مہیا کی گئی تھیں۔ جو ایک ایک رات کا ایک ہزار روپیہ نقد گنوا لیتی تھیں۔ اور کئی دن پہلے سے یہ سارا انتظام شروع ہو گیا تھا۔ نواب اقتدار جنگ کے لئے سب سے زیادہ غور کرنے کا لمحہ وہ تھا جب فرماں روا نے دکن میر عثمان علی خان نے اس شادی میں شرکت کرنے کا وعدہ فرمایا۔ لیکن نواب اقتدار جنگ کہ واقعی پرکھوں کے نواب تھے اور بات کے پکے اور خند کے پورے، ایک ہی چھوٹی سی بات پر اڑ گئے اور کوئی یقین کرے نہ کرے حیدر آباد دکن کی تاریخ، میں یہ واقعہ بھی ہوا کہ محض بیٹی کی ایک جھلک دیکھ لینے کی پاداش میں ہونے والے داماد کو چھٹی کر دی گئی، اور ایک کروڑ روپیہ جو شادی کے

انتظامات، جوڑ، جماؤ، جہیز و ان کے سلسلے خرچ ہوا تھا۔ ”او نہہ“ کہہ کر ٹھلا دیا گیا بات کچھ بھی نہ تھی۔ جس دن رصنیہ بانو مایٹوں بھٹائی گئیں تو ایسی پیاری اور حسین نظر آرہی تھیں کہ روایتی کوہ قاف کی پریوں کا حسن بھی ان کے سامنے ماند! ہلدی کی رسم کے لئے جب دو لہا والے بڑی ڈیوڑھی میں آئے تو کسی نے دو لہا سے کہہ دیا کہ ”دلہن نے وہ روپ نکالا ہے کہ بس دیکھو تو جل کر رہ جاؤ، خاک ہو جاؤ۔“ کچھ تو جوانی کا جوش اور کچھ ہر ہونے والے دو لہا کی سی شدید بے تابی اور چلبلاہٹ — جس کرے میں رصنیہ بانو مایٹوں بھٹائی گئی تھیں اس کے پھیلی طرف الی بڑی کھڑکی کے پھتے پر چڑھ کر انھوں نے چپکے سے کل اپنی ہو جانے والی دلہن کی ایک جھلک بھی نہ دیکھی ہوگی کہ اتفاقاً کسی کام سے نواب اقتدار جنگ کا ادھر سے گزر رہا تھا۔ اور وہ جیسے دہک اٹھے۔

”مانا کہ کل دلہن ان کی ہو جائے گی لیکن آج تو غیر محرم ہیں۔ یہ کوئی شرافت نہیں ہے۔“ اور انھوں نے اتنی آسانی سے یہ رشتہ توڑ دیا۔ کہ کوئی دھماکے کو بھی ایسے نہیں توڑتا۔

رصنیہ بانو سات پردوں میں رہنے والی شہزادی! غم نہ کرو۔ کیا کہیں بزم نہیں جڑے گا۔؟ لیکن باپوں کی صندوق پر ایسی قربانیاں کہاں تک جائز ہیں۔؟ وقت گزر رہا ہے۔ گزر رہا ہے۔ گزرتا جاٹے گا۔ اس ڈیوڑھی کی دیواریں۔ کھوکھلی ہو رہی ہیں۔ میں تمہارا آئینہ ہوں۔ تمہارا عکس، تمہارے دل کی بات، جاننے، پہچانتے والا، بچپن، کے نو خیز امنگوں کے چھپر، چھپر، ٹھٹھیل کود کے دن گئے۔ اور ساتھ ہی وہ دن بھی لہ گئے، جب بلایاں سونے

کے گھنگروں پہن کر، چاندی کی پلنگریوں پہ سوتی ٹھٹھیں اندر چاندی کی گھنگریوں
میں میوے والا دودھ پیتی ٹھٹھیں — اور جن کے پنجے میں روز ایک مرغی ذبح
کی جاتی تھی — اب پولیس ایکشن ہو چکا ہے۔ یہ تمہارا میرا جنت نشان حیدر آباد
دکن، جہاں کی سڑکوں پر حضور نظام کی موٹر گاڑی نکلتی تھی تو سارے میں سناٹا
پھیل جاتا اور تیز سٹیوں کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا کہ ہر راہ گیر سڑک
چھوڑ کر فٹ پاتھ پہ ہو جائے۔ اور دوسری گاڑیاں اور سواریاں تیز تیز راہ چھوڑ
کر نکل جائیں یا ایک طرف ہو کر کھڑی ہو جائیں۔ اب دھیرے دھیرے
اپنی عظمت کے نقوش کھو رہا ہے۔ یہ بہت دن تمہیں گلے لگا کر نہ رکھ سکے گا۔
بھاگ جاؤ۔ کہیں بھی منہ چھپا لو — ایسا نہ ہو کہ آنے والا وقت تمہارے
سرکش سر کو جھکا دے!

بڑی بیگم کا جنازہ صحن کے بیچوں بیچ رکھا ہوا تھا۔ زمینداری جاگیرداری
اور نوابی ٹھکانے کے خاتمے کی خبر سنتے ہی ان کا دم یوں نکل گیا جیسے غبارے
سے محض ایک سوئی کی نوک چھب جانے سے ہوا نکل جاتی ہے۔ نواب اقتدار جنگ
سمت زل سمیت جان بچا، ان پر اس خبر سے کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ انھوں نے،
جیسے پرانی سے کہا "اجاروں کوئی نئی خبر یہاں چاہیٹیں چلو آج یہی خبر سہی"
لیکن بیگم صاحبہ کی موت نے انھیں بھی ہلا کر رکھ دیا — تو گویا اب
رضیہ بانو کی پودنی پورنی ذمہ داری ان ہی کے سر آ پڑی۔ رضیہ بانو کی شادی کوٹنے
کے بعد کئی پیغام اس کے لئے آئے۔ لیکن انھیں ہر پیغام میں کوئی نہ کوئی نقص
نظر آتا گیا بیگم صاحبہ جھلا کر کہہ اٹھتیں۔ "اب سارے حیدر آباد میں اچ کیرے

پڑ گئے تو کوئی آسمان کا تارا توڑ کو لاؤ بیٹی کے واسطے۔“

”وہ بھی ہو جائیں گے۔“ وہ ہنس کر کہتے۔

لیکن آج وہ سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ چلتی تو ان ہی کی تھی، لیکن ایک احساس کسی کی دوسرا سہت کا، سکھ دکھ بانٹ لینے کا احساس۔ آج سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ وقت کیسے بدل جاتا ہے خداوند!

”کہو میاں کیسے آئے؟ کہاں سے آئے۔؟“ شبیر میاں کو دیکھ کر نواب
اقتدار جنگ بولے۔

”جی شادی سے آ رہا ہوں۔“ شبیر میاں نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔
”کس کی شادی بھی؟“ نواب صاحب ذرا مسکرائے۔

”وہ تو مجھے خود بھی پتہ نہیں۔“

”پھر؟“ نواب صاحب نے حیرت سے کہا۔ ”رقعے پر کسی کا نام نشان
ہوئیں گا۔؟“

”یہاں رقعہ وقوعہ نہیں چلتا تایا آتا۔ اپن تو جہاں بھی شادی دیکھتے ہیں۔
جاد دھکتے ہیں۔“

جب سے زمیں داری اور نوابی ختم ہوئی تھی، اور ایک ایک کر کے سارے
ٹھاٹ باٹ رخصت ہو گئے تھے۔ اور وثیقہ طے لگا تھا۔ جو کہ دونوں گھرانوں کا
برائے نام ہی تھا، ان شبیر میاں نے یہی وعدہ شروع کر رکھا تھا۔ (اس طرح کھٹ
پینے کی بڑی فراوانی رہتی تھی، سر شام ہی سے وہ گھر سے نکل جاتے، راستے میں جہاں
بھی ٹیس ہنڈ سے دھوکا دھتا دیکھتے، فوراً براتی بن کر پہنچ جاتے۔ سیدھے دو،
کے پاس جا کر پہلے تو ”مبارک ہو جناب“ کا لغزہ لگاتے اور پھر ایک دم گلے سے

لیٹ جاتے۔ اب دولہا دلے یہ سمجھتے کہ دولہن والوں کی طرف سے ہوں گے جب ہی بے تکلفی کا یہ عالم ہے کہ آتے ہی دولہا سے لیٹ پڑے۔ اس طرح دونوں طرف سے ان کی آؤ بھگت اور خاطر ملاقات ہوتی کہ مدد دن بعد بھی کھانا نہ ملتا تو پروانہ ہوتی۔

شادیوں کے سیزن میں ان کی خوب موج ہو جاتی۔ ویسے خاصے پڑھے لکھے تھے لیکن حالات نے کمزور دی تھی۔ طبیعت میں سنسی مذاق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ تھوڑی پامسٹری بھی سیکھ رکھی تھی۔ کسی نہ کسی کا ہاتھ دیکھتے رہتے خوش کرنے کی باتیں زیادہ بتاتے، کچھ دل سے بھی جوڑ دیتے۔ بُری باتیں صفا گول کر جاتے۔ رصیہ بانو کا ہاتھ دیکھ کر اُسے بہت دلاسہ دیا تھا۔ ”گھر نہیں بیچی۔ تیرا مستقبل بے حد شاندار ہے۔ بے حد پیسہ آئے گا تیرے ہاتھ میں۔“ ادھر جب سے جاگیر اداری چھنی تھی، بس دودھ کی روٹی کے بھی لالے تھے۔ نام نہاد بڑے پن کی لالچ میں جو ایک کر دڑ پڑے کا پھٹکا کمر پڑا تھا۔ اس نے آگے ہی کھوکھلا کر دیا تھا۔ اوپر سے زمینات بھی چھن گئیں۔ رہا سہا اثاثہ کتنے کتنے دن کام آتا۔ ایک ایک کر کے، گھر دکانیں اور جو کچھ بھی جائداد تھی بکتی رہی۔ نوبت گھر کے زیور پر آ کر ٹوٹی، بیٹا کوئی تھا نہیں کہ نوکری کر کے آسرا بننا، بیٹی کیا کرتی۔ خود بوڑھے ہو گئے تھے۔ اور زمانے کی مار نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ ایسے حالات میں امید افزا دنوں کا ہلکا سا تصور بھی دل کو خوش کر دیتا ہے۔ لیکن رصیہ بانو نے ہاتھ چھڑا کر بہت گہرے دکھ کے ساتھ کہا۔ ”شبیر بھائی۔“ خواہ مخواہ زخموں کو مت کھرچو۔ آپ کو معلوم نہیں حالات کیا ہیں۔ یا پھر میرے کو اُتو بنائے رہیں۔“

اب کیا ابھی ہم ایسا سوچ بھی سکتیں کی ہمارے پاس پیسہ آئیگا۔؟ اور اس نے سر جھکا کر آنسو پونچھے تو شیرمیاں لرز کر رہ گئے۔ بے چاری کے سر میں یہاں وہاں سفید بال نظر آ رہے تھے۔ بال سفید ہونے کی تو یہ عمر نہ تھی!

وہ بڑا بھیا ناک دن تھا۔ جس مہاجن کے پاس یہ کوٹھی رہن تھی، جس میں وہ آج تک رہتے آئے تھے۔ وہ سارے کاغذات لے آیا تھا، ڈیوڑھی کا سامان تو ایک ایک کر کے بک ہی چکا تھا۔ اب خالی ڈھنڈار کوٹھی میں کھا ہی کیا تھا۔ عزت سادات اسی میں تھی کہ تھوڑے بہت روپے جو بھی اس نے پھیلی پر کھ ڈئے۔ چپکے سے لے لیں۔ اور ڈیوڑھی خالی کر دیں۔

دو دن کی مہلت مہاجن سے مانگی تھی، جو اس نے ازراہ رواداری دے دی تھی۔ اپنے ایک ملنے والے کے توسط سے پرانے حیدر آباد کے ایک سستے محلے ”پنچھی بُراق“ میں ایک چھوٹا سا مکان مل گیا۔ چند گنتی کے برتنوں اور ایک بستر پیٹ کے ساتھ جب دونوں باپ بیٹی اپنے نوکروں سے بھی گئے گزرے مکان میں اترے تو ایک رکشا والے نے دوسرے رکشا والے کو آنکھ ماری۔

”نیا مال ہے سارے۔ دیکھتا کیا ہے؟“

رضیہ بانو لرز کر رہ گئی۔ قسمت نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، حالات تو سب ہی کے بدلے تھے، لیکن سب کے پاس جذبات کے ساتھ بسا تھا عقل بھی تھی۔ پتہ کے پاس نرے جذبات ہی جذبات تھے۔ جنہوں نے اپنے وطن عزیز کی سو کو آسمان جانا، اور کہیں جانے کے بارے میں بھول کر سوچا نہیں۔ ان کے کتنے سارے، عزیز آج پاکستان میں تھے۔ اور کچھ تو کلیم میں جائداد حاصل کر کے اور کچھ

چار سو بیسی کر کے آج بھی راج کر رہے تھے۔ لیکن پتا تھے جنھوں نے ہر موقع پر صرف اپنا ہی ہٹ چلائی تھی۔

”پتا! رصنیہ بانو دکھ سے بولی۔ ”آج چا دل با مل ختم ہو گئے ہو۔۔۔۔۔“
اس نے رکتے رکتے کہا۔ ”وال بھی۔ اشد پتا! وہ سسک کر بولی۔ ”ہم لوگاں
بہت گناہ کرے تھے کیا؟“

”بھیرو بی بی۔“ وہ اٹھے۔ دروازے تک گئے۔ ہاتھ زندگی بھر
اٹھا ہی رہا تھا۔ مگر دینے کے لئے، لینے کے لئے ہاتھ کیسے اٹھاتے؟ کچھ
دیر سوچا کئے۔ کیسے آواز لگائیں۔؟ کس سے بھیک مانگیں؟ پھر ایک خیال
آیا انھیں۔ چاندی کا وہ کٹورا آج تک ان کے ساتھ تھا جس سے سہاگ
رات کو باری باری میاں بیوی نے ایک ایک گھونٹ کر کے دودھ پیا تھا۔
سوچا اسے دروازے کے سامنے ایک کپڑا پھیلا کر رکھ دیں۔ جو بھی رحم دل
ہوگا، سمجھ لے گا۔ غیرت مند فقیر ہے، خیرات کے لئے رکھا ہوگا، کچھ نہ
کچھ ڈال ہی دے گا۔ ایک کپڑے پر کٹورا رکھ کر دھڑکتے دل کے ساتھ گھر میں گئے۔
تھوڑی تھوڑی دیر بعد جا کر جھانکتے کہ شاید کسی نے کچھ ڈال دیا ہو ہر بار
مابوسی ہوتی۔ تھوڑی دیر بعد پھر گئے تو کٹورا ہی غائب تھا۔! اگر یہ انجام محال ہوتا
تو کچھ روپے چاندی بیچ کر ہی بنا لیتے۔ مگر جذبات! بی بی کی چیز سے جو رکاوٹ گہرا
تھا، وہ نیچنے دیتا!

اک دم وہ بیٹی کو گلے لگا کر چیخ چیخ کر رو پڑے۔ ”بیٹیا، میں تمہاری زندگی
تباہ کر دیا۔ اشد مجھے کبھی معاف نہیں کریں گا۔ روزانہ راتوں کو میں دعا میں مانگ

مانگ کر رویا ہوں۔ کی انڈر تو میرے حضور معاف کر دے۔ میری پچی کے نصیب کھول دے۔ مگر ایسا لگتا بٹیا کی انڈر بھی ہم سے ناراض ہو گیا ہے۔ بٹیا میں تو کیسا بھی کر کے بھیک مانگ کر بھی جی بے سکتا ہوں، پر بٹیا تم۔ تمہارا کیا ہو میں گاہ؟ پھر وہ ہلک ہلک کر رونے لگے۔ ”انڈر میری بیٹی کو کسی ٹھکانے سے لگا دے محبوب۔“

دو دن گزر چکے تھے، گھر میں کچھ تھا بھی نہیں۔ پکا بھی نہیں۔ رضیہ بانو اپنے چھوٹے سے بوسیدہ مکان کی کھڑکی میں بے رنگ بے مقصد نگاہوں سے سڑک کو گھور رہی تھی۔ کہ نیچے سے اک رکشا والا اسے دیکھ کر مسکرایا۔ رضیہ نے اسے دیکھا تک نہیں۔ کھڑکی سے ہٹی بھی نہیں۔ رکشا والا سمجھا بات بن گئی وہ زور زور سے پیڈل مارتا ہوا چلا گیا۔ رات کے کوئی گیارہ بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ نواب اقتدار جنگ، دروازے پر گئے تو رکشا والا، رازداری سے بولا

”باٹی جی ہیں؟“

”باٹی جی؟“ نواب صاحب کا دل دھڑکا۔ وہ مونہہ سے کچھ کہہ بھی نہ پا ئے تھے کہ رکشا والا بول اٹھا ”موٹی اسامی ہے۔ ہاں۔“

نواب صاحب کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔ بے جان سے پتلے کی طرح وہ راستے سے ہٹ گئے ”موٹی اسامی“ جواب تک رکشا ہی میں بیٹھی ہوئی تھی، رکشا والے کا اشارہ پا کر اتری،۔ اندھیرے میں کچھ کنسیر کھینچ کر ہوئی، رکشا والے نے اپنا کرایہ، اپنا مختانہ ”لیا اور اندھیرے میں

رکشا کو ہاتھوں ہی میں پکڑے پکڑے کھو گیا

جب وہ — ہاں وہی جو سات پردوں میں رہتی تھی، جس کی ایک جھلک بھی اس کا اپنا ہونے والا شوہر تک نہیں دیکھ سکتا تھا، جب وہ حالات کے ہاتھوں بک گئی تو صبح کے طلحے اُجالے نے اس کے ہاتھوں میں دس دس کے کئی نوٹ دیکھے۔

وہ پاگل بھی نہیں ہوئی، اس نے جو اس بھی نہیں کھوئے، اُسے البتہ اس بات پر پورا یقین آگیا کہ شبیر بھائی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کے ہاتھ کی لکیریں بتاتی ہیں کہ وہ بہت پیسہ کمانے والی ہے۔

دونوں ہاتھوں میں ڈھیر سارے نوٹ اٹھائے جب وہ پچھی براق کے بدنام محلے والے ایک چھوٹے سے مکان میں اپنے باپ کے سامنے پہنچی تو پہلے تو باپ کو سوچھا ہی نہیں کہ وہ کیا کہے۔ پھر جب وہ روپے باپ کے سامنے ڈال کر کمرے میں واپس چلی گئی تو دو دن کے بھوکے پیٹ نے خوش ہو کر پرورگار کے سامنے ہاتھ اٹھا دئے۔

”شکر ہے میرے مالک کہ میری بیٹی کو ایک ٹھکانا مل گیا۔“

پانچواں مینار

افوہ ! پوری حرافہ تھی کمبخت !

جہاں جاتی وہاں آگ لگا دیتی۔ لینا ایک نہ دینا دو۔ مگر کسی کے پھٹے میں پاؤں اڑانے کی عادت ایسی پکی پڑ گئی تھی کہ پوچھنے نہیں۔ طراری کا وہ عالم تھا کہ ابھی یہاں تھی اور ابھی اچھال چھٹکا بنی وہاں۔ ساری ڈیوڑھی کو گھما کر رکھ ڈالا تھا۔ نہ شرم نہ حیا۔ کبھی باپ کے کمرے سے نکل رہی ہے۔ کبھی بیٹے کے۔ بڑے مزے سے کہتی۔ ”میرے کو کیا جی۔ باپ ہو کی بیٹا۔ اپن تو بس۔ دیوال ہیں دیوال۔ بس دینے سے کام ہے، مانگے والا کوئی بھی ہو، میری جوتی سے کی رشتے نلٹے آنکھتی بیٹھوں۔“

شیشے کا سا بدن تھا، جس میں گلابی رنگ بھرا ہوا تھا۔ ماں نے شاید سی

مناسبت سے نام ہی گلابی رکھ دیا تھا کہ بے بھاؤ گلابیاں چھلکاتی پھرتی۔ سارا شوق بس کپڑوں کا تھا۔ ہرے، نیلے، پیلے، کالے، اودے، قرمزی، شہابی، انگوری۔ بس رنگا رنگ کپڑے ہوں۔ چاہے کسی بھی ذریعہ سے ملیں۔ کوئی ہتھیلی پر پیسے دھرتا تو بدک اٹھتی۔

”میرے کو یہ روپے، اٹھنیاں، نکو پچڑاؤ۔ امی نے لیں گی، اس نے بدلے میں ایک اوڑھنی لاد لیو۔“

پاجاموں کرتوں، اوڑھنیوں، غراروں، شلواروں کا ایک ڈھیر لگا رکھا

تھا، ڈیوڑھی کی بیگمات میں ساڑھی بھی نئی نئی مقبول ہو رہی تھی۔ نیا پنہا دا تھا بڑا اچھا لگتا تھا۔ اس کے پاس ساڑیاں بھی اتنی ڈھیری جمع ہو گئی تھیں کہ اس کی حیثیت والیاں دیکھ کر دانتوں میں انگلی دبا لیتیں۔

ڈیوڑھی والے کہتے "گلی" (یہ اس کے نام کی بجڑی ہوئی شکل تھی) کے کاٹے کو پانی مانگنے کی بھی سدھ نہیں رہتی۔ ایسا ڈستی کہ ساری جان آنکھوں میں آ آ لگتی۔ آنکھیں جو بس اسے دیکھتے ہی رہنا چاہتیں۔ برساتوں میں گھن گھن پانی برستا اور سب لوگ چھپ چھپا کر کمروں، دالانوں میں بیٹھے ہوتے تو وہ جان جان کر ایک سے ایک باریک کپڑے پہن کر بھیگی بھیگی پھرتی۔ اور جسم جب دوسروں کو دعوت گناہ دیتا تو ذرا سے اشارے پر کسی نہ کسی کمرے میں گھس جاتی۔ کوئی ساتھ والی پوچھتی۔ "کہاں گئی تھی گے کتے؟" وہ بڑی لاپرواہی سے بولتی "ذرا میاں کو ناشتہ" کراری تھی۔ "چوما چاٹی" کو وہ ناشتہ بولتی اور جو معاملہ اس سے آگے بڑھتا تو بڑی ڈھٹائی سے اور بے شرمی سے کہتی۔ "کھانا کھلا لے کو آرٹی یوں۔"

بقول اسی کے "میں جدھر نکل گئی ادھر چھو طوفان مچ گیا۔" ایسے میں نزاکت جہاں کو اپنے عاشق کا ممتحن لینے کے لئے گلی سے اچھا ممتحن نہ مل سکا۔

محبت کے کھیل بھی نزلے ہیں! بھیڑی واہ۔ کوئی سُنے تو کیا سوچے کہ اتنے بڑے لڑا ب لڑیس الدولہ کی اکلوتی بیٹی اور محبت بھی ہوئی تو کس سے؟ اپنے باپ کی ڈیوڑھی کے ایک حقیر سے پالکر سے پروردہ احسن سے!

بڑی نواین نے مدتوں پیچھے ایک چھوکری پالی تھی جس کی شادی ڈیوڑھی
 ہی کے ایک ملازم سے کر دی تھی۔ سال پیچھے ایک لڑکے کو جنم دیتے ہوئے وہ چھوکری
 اللہ کو پیاری ہو گئی۔ بڑی نواین (کہ ساری ڈیوڑھی کے نوکروں، مالکوں کی بی بی
 ماں بھینس) اس یسیر چھوکرے کی بھی اماں ہی ٹھہری۔ ملازم کی شادی کسی اور
 چھوکری سے کر کے اسے صاف جتا دیا،

”میاں تم یہ سمجھ لیو کی تم کنوارے۔ تمہی اور اب تمہاری شادی ہو گئی
 یہ بچہ میں لے لی۔ تم بے شک اس کو پیار کرنا، مگر یہ مت سمجھنا کہ اپنے
 تمہارا کوئی ہے، کیوں کی میرے کو معلوم ہے کی سو تیلے ماداں کہتی بھی محبت
 کرے تو وہ جھوٹی اپج ہوتی۔“

احسن بڑا ہوا تو بی بی ماں نے اُسے ایسے پیار سے جیسے اپنا ہی
 پوتا ہو، مولوی صاحب کے ساتھ بٹھایا۔ چار برس، چار مہینے، چار ہفتے
 چار دن کی ننھی سی جان کو جب بسم اللہ پڑھائی گئی تو پوری ڈیوڑھی میں بھی
 اسی طرح جشن ہوا جیسے کسی مالک کے بچے کی بسم اللہ پڑھتا ہے۔

بی بی ماں نے احسن کو گود میں بٹھا کر پیار سے پوچھا، ”بابا آج تمہاری
 بسم اللہ ہے۔ تے چار برس، چار مہینے، چار ہفتے، چار دیناں پورے
 کر لئے۔ آج تم کیا منگتے؟“ اور انھوں نے سامنے پھیلے ہوئے مسٹھائی
 کھپلوں اور دیگر ملازم کے نوکروں کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن احسن جو اس وقت، مہربان رانی کی گود میں بیٹھا روایتی
 شہزادہ بنا ہوا تھا۔ اس مانگ پر کہ مانگ کیا مانگتا ہے؟ ایسی ویسی چیز
 مانگنے والا نہ تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی ذہین اور بے چین نگاہیں دھر

اُدھر گھائیں، اور بی بی ماں کی بڑی بہو یعنی نواب نفیس الدولہ کی بیگم کی گود میں بیٹھی ننھی ننھی سی گڑیا کی طرف اشارہ کیا اور انتہائی بے تکلفی سے بولا

”میں تو یہ گلیا بیوں دا۔“

نزاکت جہاں اس وقت دواہ کی بھی نہیں ہوئی تھیں، ابھی ابھی تو بڑی بہو بیگم چھتہ ہنسا کر اٹھیں تھیں۔ احسن کی اس مانگ کے ساتھ ہی یہاں سے وہاں تک ساروں کو سانپ سونگھ گیا۔ بڑی دیر کے سناتے کے بعد بی بی ماں بات بھانے کو ہنس کر بولیں۔

”اگے پگلے چھو کرے لوگاں گڑیا نہیں کھیلتے۔“

لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ اس چھو کرے نے گڑیا ہی پسند کی تھی اور یہ پسند ایسی تھی بھی نہیں کہ بوں پسند کیا یوں بھلا بیٹھے یہ وہی پسند تھی جو آگے چل کر صحراؤں کی خاک چھنوا دیتی ہے۔ جو پتھروں کو کاٹ کر نہیں نکلوا دیتی ہے۔

بی بی ماں نے اپنے جیتے جی جو عہد اپنے خدا سے کیا تھا وہ پورا کر دکھایا اسلامی تعلیم پوری ہونے کے بعد انھوں نے احسن کو حیدر آباد دکن کے ایک سے ایک اعلیٰ اسکولوں میں پڑھوایا، بڑے نواب صاحب جن کو تعلیم کا شوق جنون کی حد تک تھا، خاندان کے سارے غریب اور نادار رشتہ دار لڑکوں کی تعلیم کا بار اٹھائے ہوئے تھے۔ ڈیوڑھی کے باہر مڑانے میں گویا ایک ہوسٹل کھول رکھا تھا۔ کھانے پینے، کپڑے، لٹے کے اخراجات سے لے کر ہر چیز انھوں نے اپنے ذمے رکھی تھی۔ ہر سال لڑکوں کی کھیپ کی کھیپ پڑھ کر نکلتی۔ لیکن ڈیوڑھی کی تاریخ میں یہ پہلا

واقعہ تھا کہ کسی پالکڑی چھوکری کے بیٹے نے کالج کا مونہہ دیکھا ہو اور نہ صرف
مونہہ دیکھا ہو بلکہ بی اے کی ڈگری بھی حاصل کر لی ہو۔

اور یہ ٹھیک انہی دنوں کی بات ہے جب نواب نفیس الدولہ کی اکلوتی
بیٹی نزاکت جہاں کے حسن جہاں تاب کا سورج عین نصف النہار پر جگمگا رہا
تھا۔ اور وہ کو یہ بات یاد رہی ہو تو رہی ہو کہ چار سال کے ایک ننھے سے
بچے نے کیا چیز اپنی منہ بولی دادی سے مانگی تھی۔ لیکن خود بچہ یہ بات بالکل
نہیں جانتا تھا۔ ویسے بھی اس نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں جہاں
قدم قدم پر امارت کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ کالج میں جو لڑکا اپنے
راہتیوں میں اس قدر بے باک، کھلنڈا اور ذہین مشہور تھا، وہ حویلی
کی چار دیواری میں قدم رکھتے ہی چوہا بن جاتا۔ اس نے غریب امیری کے فرق
کو ہوش سنبھالتے ہی جان لیا تھا، لیکن اس بد نصیبی کا کیا علاج تھا
کہ ایک دن رمضان شریف کے تیسویں روزے کو، عید کا چاند دیکھنے ڈیوڑھی
ہی کے سارے لڑکے باسے، اور لڑکیاں، چھوکریاں، چاندنی پر چڑھے ہوئے
تھے کہ اچانک اسکو زمین پر ہی چاند نظر آ گیا۔ پہلی کا بار میک، نوکیلا
چاند نہیں، چودھویں کا جھم جھماتا چاند۔ وہ چاند جو بیک وقت اس کے
دل کو ایک ساتھ روشن اور تاریک کر گیا۔

بڑے نواب ادربی بی ماں مدت ہوئی ختم ہو چکے تھے۔ اب اس
ڈیوڑھی کا سارا کاروبار نواب نفیس الدولہ اور ان کی بیگم کے ہاتھ میں تھا
بڑے نواب میں پھر بھی یہ خوبی تھی کہ وہ انسان کو انسان سمجھتے تھے، لیکن
نفیس الدولہ تو تلوار کی دھار تھے۔ اپنی آن بان اور اونچی ناک کے سوا،

بھنی کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ بڑے نواب کی زندگی میں ان کے بنائے ہوئے ہوٹل کے غریب رشتہ داروں کے لڑکوں کا زمان خانے میں کسی کام سے چلے آنا میسر نہ تھا، لیکن نواب نفیس الدولہ نے یہ حکم لگا دیا تھا کہ ”بلا اجازت کوئی زمانے میں پاؤں بھی نہ دھرے۔ پہلے ہمارے سے آکر پوچھو پھر اندر جاؤ۔“

ایسے میں کسی کے زمان خانے کے اندر بھٹکنے کی بات سوچی تک نہیں جاسکتی تھی۔ لیکن جہاں چاہو وہاں راہ تو نکل ہی آتی ہے۔

نزاکت جہاں انٹر میں بیٹھنے والی تھیں۔ انگلش تو فر فر بولتی تھیں۔ گاڑی آکر اٹکی تھی حساب میں۔ حساب سے ان کی جان جاتی تھی۔ پیاتک بات پہنچی۔ اکھنوں نے حیرت سے کہا،

”حد ہو گئی۔ ڈیوڑھی میں اتنے سارے چھوکرے ہیں۔ اردو، انگلش، تیلگو، ہسٹری، جغرافیہ، حساب، جیومیٹری، الجبرا جتنے چاہو اُتے ماسٹراں، تم بی بی کاٹے کو اپنا جی خراب کرتے، کل سے احسن تم کو پڑھا دیا کرے گا۔ اب کوئی یہ سوچے کہ حساب کے درس کے ساتھ ساتھ احسن نے عشق

کا درس بھی دینا شروع کر دیا۔ تو یہ سوچنے والے کی اندھی عقل کا قصور، وہ تو بیچارہ ایسا بوم کی ناک کہ دو اور دو چار کا حساب بھی نزاکت جہاں کے سامنے بھول جاتا۔ نیچے سر کر کے جو بیٹھتا تو آنکھ اوپر نہ ہوتی، کتنی غلطیاں تو خود نزاکت جہاں نکال دیتی۔ جواب بھی نیچا سر کئے ہی دیتا۔ اور غالباً نواب صاحب کی سوچی سمجھی اسلیم ہی تھی جو احسن کو مقرر کیا کہ گھر کا نوکر آدمی ہے، عزت کا خیال کر کے ہی پڑھاٹے گا۔

اور نزاکت جہاں کو ان نیچی نگاہوں کی مار ہی تو لے ڈوبی۔ دیدیں

میں دیدے ڈال کر، ہاتھوں، پیروں کو چھو چھو کر اگر وہ کوئی الٹی پٹی حرکت کرتا تو شائد وہ بھی اس کے نیچے خون کی قاتل ہو جاتیں مگر اس نے تو کبھی بھول کر بھی اس کے چہرے پر نگاہ نہ ڈالی جو سیاہ دانتوں میں اس کے مقدر کی روشنی بن کر جم چماتا تھا۔

جب امتحان کو چند دن رہ گئے تو اچانک نزاکت جہاں کو احساس ہوا کہ وہ مرجائیں گی۔ بن موت مرجائیں گی۔ احسن کا پڑھانا ختم ہو جائے گا اور زندگی سے ان کا نا طہ بھی ختم ہو جائے گا۔ یہ عجیب بات تھی کہ پڑھائی کے دوران، کبھی دونوں میں پڑھائی سے ہٹ کر کوئی بات نہیں ہوتی تھی لیکن اس دن نزاکت جہاں نے پوچھ ہی ڈالا: ”احسن تمہارا اب کیا ارادہ ہے؟ بیٹے تو تم کر ہی ڈالے۔“

وہ ہنسا: ”ارادہ؟ میرے خیال سے میں نوکری کر لیوں گا۔“
 ”نوکری؟“ وہ حیرت سے بولی۔ ”اس ڈیوڑھی میں آج تک کوئی نوکری کرا۔؟“

احسن نے دکھ سے بھاری آواز میں کہا: ”آپ کا شکریہ بی بی پاشا کہ آپ مجھے ڈیوڑھی دالوں میں سے ایک سمجھتے۔ مگر میں آپ کو یاد دلا دیوں کہ میں ڈیوڑھی والا نہیں۔ ڈیوڑھی کا ایک خیر نوکر ہوں۔“
 نزاکت جہاں کچھ نہ بولی۔ تھوڑی دیر سوچ کر وہ مسکرائی۔ ٹھیک ہے۔ میں پتا سے بولونگا کی وہ آپ کو ایسا کوئی کام دے دیں کہ آپ کو باہر جانے کی کھٹ کھٹ نہ ہو۔ اپنے مختار عام بہوت بڑھے ہوئے ہیں۔ کبھی آپ ان کا ہاتھ بٹائے، محل کے حساباں سنبھالے

تو آپ چھوٹے مختار عام ہو جائیں گے۔ تنخواہ سو سے تو اوپر چلے گی۔
 احسن نے بڑی احسان مندرنگاہوں سے اُسے دیکھا اور جنم جنم کی ہمیش
 سمیٹ کر بولا۔ ”آپ کے شکریے کے واسطے میرے پاس لفظاں نہیں
 مگر اب میں حیدر آباد میں رہنا نہیں چاہتا۔“

”کیوں؟“ نزاکت کی آواز میں حیرت اُٹھ پڑی
 ”اس واسطے کہ یہ شہر میرے کو کوئی خوشی نہیں دے سکیں گا۔
 بی بی پاشا، میں جو چاہوں گا میرے کو ملنے سے تو رہا، پھر اپنا دل آپ
 جلا کے کوئی فائدہ نہیں۔“

”مگر تم چاہتے کیا احسن؟“ نزاکت جہاں نے اپنی بڑی بڑی
 آنکھیں پھیلا کر حیرت سے پوچھا۔
 ”وہ جو زندگی بھر سر جھکاتا آیا تھا، آج جانے کہاں سے اتنی ہمت
 سمیٹ لایا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے بولا۔
 ”بی بی پاشا، میں آپ کو چاہتا ہوں۔“
 اور وہ اس کے حواسوں پر بجلی گراتا، یوں کرے سے نکل گیا
 کہ وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

گلی اور نزاکت جہاں ساتھ ساتھ کھیلی، پٹی بڑھی تھیں۔ سماجی
 رتبے اور درجے کے فرق کے ہوتے ہوئے بھی دونوں میں ایسی پکی دوستی
 تھی کہ کوئی پوچھے نہیں۔ گلی کے عاشقوں کی ایک ایک داستان
 نزاکت جہاں کو معلوم تھی۔ اس کا حرافہ پن، اس کا کپڑوں کا شوق، اس

آدارگی، اس کی ساری کمزوریاں، بی بی پاشا، کو معلوم تھیں اس کے باوجود دوستی کا دھاگا اتنا مضبوط تھا کہ بہو بیگم لاکھ بی بی پاشا کو ڈانٹیں کہ۔
 ”ایسے چھٹیلوں میں اتنا اٹھنا بیٹھنا ٹھیک نہیں بی بی جی۔ مگر تم سنتے
 اچ نہیں۔ بیر بہوٹی کو ڈبی میں رکھ کو چاول کے سفید دانے ڈال دیو تو آنے
 بیر بہوٹی اپنا رنگ دے دیتی۔ تم کاٹے کو اس کے رنگ میں رنگتے۔“

مگر نزاکت جہاں کا اپنا رنگ تھا، کوئی اور رنگ ان پر کیا اثر کرتا۔
 اوپر گلی کی امنی آسے مرے تک مارتی، ایک سے ایک ننگی گالی دیتی، مگر وہ
 تو پوٹ پوٹ کریوں ہی ہنستی ہوئی اُٹھ جاتی۔

”اگے حرام کی پوٹ تیرے کو کوئی بیاہ کو نہیں بجاوے گا۔ ماں بڑ بڑاتی
 ”کس کے باپ کی مجال ہے کہ میرے کو بیاہ کھلے جاوے۔ وہ وکیل
 گواہی ہو مرہنی لینے کو آتا، کیتے نا؟ گھونگھٹ اٹھا کو اسکلچ بونہ چو م
 یوں گی کی میرے کو تو تیرے سنگات اچ شادی کرنا ہے۔“ بیٹی بولا
 دیتی۔ اسے بھلا کوئی کیا کہتا۔؟

اس رات بی بی پاشا نے ایک ایسا فیصلہ کیا جو بڑی بڑی ہمت
 والی بیبیاں بھی نہیں کرتیں۔
 ”اگر احسن محبت میں سچا ہے تو میں سچی اسی سے اچ شادی
 کریوں گا۔“

”لیکن محبت میں پرکھا کیسے جاوے کہ شیدائی سچا ہے۔؟“
 ”گلی۔ آجکل کس کس سے تیرا عشق چل رہا ہے۔؟“ انھوں
 نے بنا کر اس سے بڑے پیار سے پوچھا۔

”اب کیا تباؤں پاشا۔ یہاں سے لے کو وہاں تک ایک سرسے
 بھی اچ اندھے پڑے ہیں۔
 ”سچی؟“ وہ مسکرائی

پھر کیا؟ پرسوں دربان کو ”ناشتہ“ کرائے آئی، پھر اس کے چھوکرے
 کو باقاعدہ ”کھانا“ کھلا دی۔ جو بڑا انگلش بگھاتا پھرتا ہے نا!
 ”چھی چھی گلی۔ تو بڑی بد معاش ہو گئی ہے۔“
 ”اب پاشا، یہ تو چلتا اچ رہتا ہے۔ کپڑے دیکھو نا پاشا، کتے
 ڈھیر سارے جمع کر لی ہیں۔“

”ٹھیک ہے کر لی سو۔ یہ تو تباہہ بڑا پڑھنتر چھوکرہ ہے نا
 احسن۔ اس کو اندھا کری کیا نیٹیں اب تک۔؟“
 وہ تن کر بیٹھ گئی۔ ”اگے پاشا۔ یہ اپنے مردوں کا کیا ٹھیکے،
 ذرا ہنس کر دیکھ لیو۔ ختم! اس نے بڑے اسٹائل سے گردن پر آڑا ہاتھ
 پھیرا۔ اور ذرا انگلی پکڑ لیو تو انوں پورا پہونچا پکڑنے تیار۔“
 ”ارے نیٹیں گلی۔ بعضے بعضے مرداں شرم و حیا پوجان دیتے
 تو سب کو ایک جیسا سمجھ رٹی۔“

”اگے جان دیونا پاشا، شرم ورم کچھ نیٹیں۔ بس عورت ہونا مردوں کو
 ”اچھا یہ بات ہے تو احسن کو پرچا کے بتا۔ تب مانوں گا۔ ہاں۔“
 اس نے کھٹ سے چٹکی بجائی۔ ”اگے پاشا آج سے تیسرے دن
 ایک ساڑھی آپ کو لا کونہ تباہی تو نام ملپا دینا۔ احسن میاں کا دیا ہوا تحفہ“

اس شام بادل ایسے چھم چھم برسے کے ساری ڈیوڑھی دھرتی کی
 سوندھی سوندھی خوجان یوا خوشبو سے بھر گئی۔ سن سن چلتی ہواؤں نے
 جانے کتنوں کو بہکایا۔ سیکڑوں قسم کے پھولوں سے ملکر ایک ایسی خوشبو
 وجود میں آئی جو آپھے اچھوں کے ایمان ڈگمگا دے۔ ماحول ایسا کافر۔
 اور اس پر گلابی نے نزاکت جہاں کے سنگھار دان سے گاڑے گاڑے اصلی
 شامۃ العنبر کی پدی کی پوری شیشی اپنے شیشے ایسے بدن پر اندیل ڈالی۔
 مٹھائی جن گلابی کاغذوں میں بندھ کر آتی تھی ان میں سے ایک کاغذ کو ذرا
 گھیلا کر کے اس نے اپنے ہونٹوں کو شفاف یا قوتوں کا رنگ عطا کیا۔ آنکھوں
 میں کاجل اتنی دودھور تک اندر باہر ڈالا کہ کالوں کی بوؤں تک آنکھیں لمبی
 دھار دار کٹار بن گئیں۔ گھنے گھنیرے بالوں کو یوں ہی پیٹھ پر چھوڑ دیا۔
 کرتا اتنے بڑے گلے کا پہنا کہ ذرا جھمکے اور ایمان والوں کا ایمان ختم۔ !۔
 شام پڑے سے پھر بوند باندی شروع ہو گئی تھی۔

”پاشا۔“ وہ طراری سے اچھلتی کودتی نزاکت جہاں کے کمرے میں
 آئی۔ آج بھوک کا صفایا سمجھو۔ احس میاں کو ایک ساتھ ناشتہ
 بھی اور کھانا بھی۔۔۔“

نزاکت جہاں نے اُسے دیکھا اور متھرا آسی گئیں۔ کون نصیب والا
 اس موت سے بچ سکتا تھا۔؟ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ مرد شریلی عورت
 پر زیادہ ریجھتا ہے۔ صاف سچی بات تو یہ ہے کہ عورت شریلی ہوتی ہی نہیں
 اشاروں سے، کنایوں سے ہمیشہ پہل وہ کمبخت ہی کرتی ہے۔ ساری،
 مذہبی کتابیں اٹھا کر دیکھ لو۔ بیچارے آدم کو بہکایا کس نے؟۔

صبح کو بڑا خوشگوار موسم تھا۔ دھلا دھلایا ماحول باغ میں سے نکھری نکھری خوشبوئیں آکر دل کو سرسے سے جینے پر آمادہ کر رہی تھیں۔ ناستہ نراکت جہاں کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ابھی پرانے کا ایک لقمہ توڑا ہی تھا کہ گلی اندر داخل ہوئی۔

نراکت جہاں نے دھڑکتے ہوئے دل سے اسے دیکھا۔ بیدار ہوئی تھی۔ ایک عورت ہاری ہوئی عورت!

”کیا ہوا؟“ نراکت جہاں نے بے پروائی سے پوچھا

”ہوتا کیا؟“ میں فانوس روشن کرنے کے بہانے پہنچی۔ ہو رہا جان بوجھ کر خریب سے گزری کی، خوشنواں انوں کا دل ایسا دلیسا کر دیں۔ پن وہ تو دیسے ہی بیٹھے کچھ پڑھتے رہے، پھر میں تو سیدھا انوں کی گودی میں جاگری تو ہلتے سے میرے کو اٹھا کو کھڑا کر بیٹھے۔ ہو رہے

”فانوس کلائے کو روشن کرتی ہے، گلابی؟“ میرا دل جو چل رہا ہے کیا اس کی روشنی اندھیرا دور کرنے کو کافی نہیں۔“

پاشا ادھر ٹھنڈی ٹھنڈی، بھگی بھگی پھوار تھی اور ادھر میرا بھٹی کے جیسا پیتا بدن۔ کوئی جیسا مرد ہوتا تو میرے کو پھاڑ کھاتا۔ پن وہ دیسے ہی ٹھونہٹ بنے بیٹھے رہے۔ میں تو جانوں نامرد ہیں انوں۔“

گلابی کی یہ گالی بھی نراکت جہاں کے دل پر پھول بن کر گری۔ پھر یہ ہوا کہ گلابی نے اسے گویا اپنے وقار کا سوال بنالیا کہ احسن کو زیر کرے۔ اپنی پاشا کے احساسات سے بے خبر وہ عورت پن کے سارے حربے آزما کر تھک گئی، لیکن وہ پہاڑ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلا۔

گلابی کی ہار نزاکت جہاں کی جیت بن گئی۔ ایک بات کو نزاکت جہاں
نے اپنے دل کے سارے درد کو سمو کر پتیا کو خط لکھا۔

میرے پتیا:-

میرے کو معلوم ہے کی آپ اپنے اصولوں کے کتے چکے
ہیں۔ آپ کی مرضی کے خلاف اس ڈیوڑھی میں ایک
پتہ بھی نہیں مل سکتا۔ پھر بھلا میں ایسا اتنا بڑا کام آپ
کی مرضی کے بغیر سوچوں بھی کیسے؟

پتیا میں یہ خط آپ کو لکھتے ہوئے کچھ عجیب سا محسوس
کر رہا ہوں، میرے کو معلوم ہے کہ یہ خط آپ کو غصہ بھی
کر سکتا ہے، مگر پتیا آپ زندگی بھر سے میرے کو اتنا پیار
دیے کہ میں اتنی ہمت کر سکا ہوں کہ آپ سے دل کی بات
خلع کے ذریعہ کر سکوں، کیوں کہ میرا کوئی راز دار سہیلی
یا بہن نہیں کہ میں اپنا پیغام آپ تک پہنچا سکوں، تم سے
میں اتنا فری نہیں۔ پھر دل کی بات کس سے بولوں؟

پتیا میرے کو معلوم ہے کہ اب الزام کے بعد میری شادی
طے ہونے والی ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر پیغام موجود ہیں
ان میں کوئی بھی لکھ پتی سے کم نہیں۔ سارے ہی ایسے ہیں
کہ میرے کو چاہیں تو زیور میں سونے میں تول سکتے ہیں۔ مگر
پتیا میں آپ سے ایک بات بولوں۔ کیا دل کی خوشی زیور اور

روپے پیسے سے مل سکتی ہے۔ ؟ میری سمجھ میں نہیں آتا
 کی میں وہ ہمت کہاں سے پالیا جو آپ کو یہ سب سنا
 رہا ہوں۔ شاید پتا وہ محبت جو بچپن سے آپ میرے
 کو دیئے میری ہمت کی زبان بن گئی ہے۔ میرے کو یاد ہے
 پتا، نوکروں کی ایک فوج کی فوج محل میں ہونے کے باوجود بچپن
 میں کبھی میں روتا تھا تو آپ کندھے سے لگا کر گھنٹوں
 ٹھہلا کرتے تھے۔ پتا اسی محبت کا واسطہ میرے کو میرے
 دل کی خوشی دے دیجئے۔ میں نے آج تک آپ سے کوئی
 چیز نہیں مانگا پتا۔ آج ایک چیز کے واسطے ہاتھ آپ کے
 سامنے ہاتھ پھیلا رہا ہوں۔ مجھے خود احساس ہے کہ یہ
 سب سن کر آپ کے دل کی کیا حالت ہو جائیگی۔
 مگر پتا محبت کا یہ تناور درخت ایک دوپل میں نیوٹن
 برسوں گزرنے پر اپنی جڑ مضبوط کرا ہے۔ اسی مارے
 میں یہ ہمت سمیٹ سکا۔ آپ کو اگر میرے سوال کا جواب
 ”نہ“ میں دینا ہے تو میرے سنگھار دان پر کل رات ایک
 موم بتی جلا کر رکھ دیجئے۔ ہاں کی صورت میں آپ کی طرف
 سے کوئی اشارہ نہیں چاہیئے۔

مجھے احسن سے بیاہ دیجئے، پتا۔ میرے کو معلوم ہے
 کی یہ سوال آپ کو اتنا غصہ دلا دے گا کہ آپ مجھے جان
 سے مار دینے پر بھی تل سکتے ہیں مگر پتا آپ اپنا اکلوتی

بیٹی کی خوشی نہیں چاہیے کیا؟

آپ کی پیاری بیٹی

نزاکت جہاں

دوسرے دن نزاکت جہاں نے اپنی سنگھار میز کو بڑے چاؤ سے جا کر دیکھا تو وہاں ایک بہت بڑی مشعل جل رہی تھی۔ بڑی ساری مشعل اس بات کا ثبوت تھی کہ پتا بچہ غصہ میں ہیں۔ ورنہ نزاکت جہاں کے کہنے کے مطابق وہ موم بتی بھی تو جلا سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے بے پناہ غصے کا اظہار یہ آگ جلا کر کیا تھا۔

نزاکت جہاں آخر کو بیچاری لڑکی ہی تھی۔ بڑی طرح ڈر گئی۔ دو تین دن تو وہ مارے ڈر کے اپنے کمرے سے نکلی ہی نہیں۔ پھر ڈر دب گیا اور اس پر بغاوت کا جذبہ غالب آگیا۔ اس نے گلابی کو بلوا بھیجا۔ گلابی کے گلے لگ کر وہ اچانک رو پڑی۔

”گلابی۔ میں احسن کے بغیر مر جاؤں گا۔“

گلابی سنناٹے میں آگئی۔ بڑی دیر بعد وہ سنبھلی

”پاشا، اب میں سمجھی۔ آپ اُنوں کو آزما رہے تھے۔ سچی بات

پاشا، غریب کے بیٹے ہیں تو کیا ہوا۔ اُنوں آپ کے اچے لائق ہیں۔“

”مگر پتا۔ پتا نہیں مانتے نا گلابی۔“

”تو بھاگ جائیے۔“ گلابی نے دوڑک رائے دی۔

”بھاگ جاؤں؟“ نزاکت جہاں مارے خوف اور حیرت کے

آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ ”اُتی بڑی حویلی سے ٹکڑے کر بھاگ جاؤں۔“

ساری دنیا کو اپنے پیار پر ہنسنے کے واسطے چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔؟ نکوٹ
 گلابی نکوٹ۔ میرے کو ایسے اُلٹے پلٹے مشورے نکو دے۔ وہ بھوٹ بھوٹ
 کر رونے لگی۔ ”اللہ گلابی میں ویسے لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔ جو
 کھلم کھلا اپنے رشتہ دار چھو کر دوں،، سنگیتروں سے چھڑھیٹاڑ دھینگا
 مستی کرتے۔ میں تو اپنے دل میں اُنوں کی محبت کا چراغ جلا لے کو بیٹھا کسی کو
 معلوم بھی نہیں کہ یہ محبت کتنی پرانی ہو گئی۔ میرے کو تو ایسا لگتا کہ میں ساری
 زندگی بھر سے ایک اُنوں کی آس میں اچ ہوں۔ اُنوں کی خاطر جی رہا
 ہوں۔“

گلابی کو اور کچھ نہ سوچھا، وہ روڑی گئی، احسن کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی
 ہوئی پچھلے دروازے میں لے آئی اور نزاکت جہاں کے سامنے ڈھکیل کر
 بولی۔ ”میری پاشا کو بھجاؤ ذرا۔ مرد ہو میں گے تو ہمت بتا کو لے
 بھاگیں گے۔ نیٹس تو..... اور وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر باہر چل دی۔
 پاگل نہ بنے بی بی پاشا۔ میں آجکل سے نہیں مدتوں سے یہ بات
 سمجھ رہا تھا کہ آپ کے دل میں کیا ہے۔ کیونکہ خود میرے دل میں بھی وہی
 کچھ تھا لیکن میں ایسے راستے پر قدم اٹھانا ہی نہیں چاہتا تھا جو منزل پر
 پہنچانے کے بجائے منزل سے اور دور کر دے۔

”تو مجھے بھگا کو لے چلو احسن۔ میرے کو یہ حویلی خفیس معلوم ہوتی ہے“
 ”بھگا کے۔؟ آپ کو؟۔ بی بی پاشا، آپ پاگل ہو رہے ہیں
 ذرا دویارہ سوچئے۔ آپ کیا بد زبان مونہہ سے نکالے ہیں۔ میں ایسا
 سوچ نہیں سکتا۔“

”میں ذات پات، امیری غریبی کو ٹھوکر مارتا ہوں۔ میں۔ میں۔ میں۔“
 جذبات کی شدت کے مارے اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ ”میں صرف تم
 کو چاہتا ہوں احسن۔ تم کو۔ تم کو خدا کا واسطہ میرے کو بھگا کے لے
 چلو۔“

”ہو سے بولیئے، بی بی پاشا۔ بازو ہی میں ثواب صاحب کا کرہ ہے
 اگر انوں سن لئے تو۔“

اور اچانک ڈرامائی انداز سے دسواڑہ کھول کر ثواب نفیس الدولہ
 کمرے میں داخل ہوئے اور چلا کر بولے۔ ”ہاں، ہاں ہم سن رہے ہیں۔
 سب کچھ سن رہے ہیں کی ہمارے جیتے جی اس محل میں کیا کیا ہو رہا ہے۔“
 شاہی دبدبے اور جلال سے ان کا سراپا کانپ رہا تھا۔

”نزاکت جہاں۔“ وہ انسلی اٹھا کر بولے۔ ”آج سے ٹھیک
 آٹھویں دن تمہاری شادی کر دی جائیگی۔ اور احسن میاں تم۔ تم کو نیکی
 آبا حضور کے دلار سے تھے بول کے ہم تم کو خالی چھوڑ رہے۔ نہیں تو
 آج تمہاری گردن اڑا دیتے۔ تم دونوں خبیثوں نے محبت کرنے سے
 پہلے یہ تو سوچا ہوتا کہ حیدر آباد دکن کی نوابی عفلوں کی ہم جان ہیں
 ہماری جو عزت اور رتبہ ہے وہ تاریخ گواہ ہے کسی کسی نصیبے والا کہہ ہی
 مل سکا ہے، ہم تم جیسے پالکڑے، نیکے آدر دوٹکے کے آدمی کو اپنی بیٹی
 بیاہ سکتے تھے، یہ خود تمہارے سوچنے کی بات تھی۔! مٹور ٹھکانا۔
 ڈھونڈنے کے واسطے تم ناہم تین دن کی مہلت دیتے ہیں۔ چو تھے دن
 تمہاری صورت یہاں نہیں دکھنا۔ سمجھے۔؟“

چوتھے دن احسن نے ہمیشہ کے لئے ڈیوڑھی چھوڑ دی۔ لیکن اکیلے نہیں؟ نزاکت جہاں کے ساتھ۔

”نواب صاحب کی بیٹی بھاگ گئی!“

”نواب صاحب کی بیٹی بھاگ گئی!“

”نواب صاحب کی بیٹی اپنے نوکر کے ساتھ بھاگ گئی!“

ہر زبان یہ کہنا چاہتی تھی، لیکن نواب صاحب کا دبدبہ کسی کو زبان نہیں کھولنے دیتا تھا۔

جان پہچان والوں میں کسی نہ کسی طور پر یہ خبر اڑ ہی گئی۔ یوں جیسے پرستینے والے آتے ہیں۔ لوگ آتے، لیکن نواب صاحب کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ وہ چہرہ جو زندگی بھر دبدبے اور رعب سے سوچ کی طرح جھم جھما رہا تھا، آج گہنا گیا تھا۔

ڈاکٹروں کے مشورے پر نواب نفیس الدولہ اپنی بیگم اور چند ملازموں کے ساتھ آب و ہوا تبدیل کرنے کی غرض سے پہاڑ پر آئے ہوئے تھے۔ جوان بیٹی جو کلنک ماتھے پر مقبوظ گئی تھیں بیگم صاحبہ بھی اس کے صدمے سے ٹٹھال تھیں۔ لیکن نواب صاحب کے غم نے ان کے اپنے غم کو دھاپا لیا تھا۔

اس دن نواب صاحب کی طبیعت ذرا بجاں دیکھی، تو بیگم صاحبہ ٹھنڈا سانس بھر کر بولیں۔ ”خدا بدلہ لینگا۔ ایسے محبت والے ماں، باپ کا دل توڑ کو گئی۔ ایسی خاندان کی عزت، کچھ نالگا کو گئی۔ خدا ترسا ترسا

کر مارینگا۔“

”مت کو سو بیگم۔ مت کو سو۔“ نواب صاحب غم اور دکھ سے

بو جھل لہجے میں بولے۔“

”کیسے مت کو سوں، وہ بھی حرام زادی، ہو اس کا سنگا، دونوں

کے تن تن میں کیڑے پڑیں گے۔

نواب صاحب نے لپک کر بیگم کا مونہہ بند کر دیا

”وہ دونوں بڑے معصوم، بڑے پیارے بچے تھے۔“ بیگم آپ

کو کچھ نہیں معلوم۔“

”آپ کا سر زندگی بھر کے واسطے جھکا کر رکھ دیئے ہو رہے ہیں بڑے

پیارے، معصوم بچے تھے۔؟

”ہاں بیگم۔ بہت معصوم، بالکل بے گناہ۔ وہ دونوں بھانجے

نہیں۔ ہم خود ان کو بھگا دیئے۔؟“

”مگر کیوں؟ کاشے کو؟“ بیگم صاحبہ حق و حق رکھ گئی

”اس واسطے بیگم کی ہم ان کا دل نہیں توڑ سکتے تھے۔ وہ لڑکا چاہتا

تو ہماری بچی کو بھگا کو بھی لے جاسکتا تھا۔ مگر ہم خود اپنے کانوں سے سنے

اس نے بولا تھا، ”میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ یہ شرافت ہر ایک

میں نہیں پائی جاتی، بیگم نسلوں در نسلوں خون چھنتا ہے تب یہ شرافت

غیب میں آتی ہے۔ جب ہم دیکھے کہ دونوں جی جان سے ایک دوسرے

کو چاہتے ہیں۔ مگر ہماری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ تو ہم خود ہی

ایک رات گاؤں لے جا کر دونوں کا نکاح پڑھوا دیئے اور یہ بات گاؤں

کے صرف چند ذرہ دار اور معتبر لوگ جانتے ہیں، لیں۔“
 ”پھر جب آپ خود اچ نکاح پڑھوا دیئے تو اتنا غم کاٹے کو لے کر
 بیٹھے۔“ بیگم جھلایں۔

”بیگم، ذرا اس باپ کے دل کے بارے میں سوچو۔ جس کی ایک
 ہی بیٹی ہو۔ جس کے دل میں یہ ارمان ہو کہ بازار کا بازار اکھاڑ کر
 شہر اٹھائے۔ اتنا دان دہیز دے کہ یہ گمان ہو کہ بازار کا بازار اکھاڑ کر
 دے دیا ہے۔ ہمارے کیسے کیسے ارمان تھے بیگم۔ لیکن ہم اپنے خود
 کے ارمان کھل سکتے تھے۔ اپنی بٹیا کا دل نیٹیں توڑ سکتے تھے۔ ہمیں اعتبار
 ہے بیگم، ہم طعنہ سن سکتے تھے کہ نواب صاحب کی بیٹی بھاگ گئی۔ لیکن
 ہم یہ نہیں سہہ سکتے تھے کہ کوئی یہ کہے کہ نواب صاحب نے اپنی بیٹی ایک
 نوکر سے بیاہ دی۔ ہم کو خوشی ہے بیگم کی ہماری بیٹی ایک اچھے آدمی سے
 بیاہی گئی۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا یہ ہماری جیت ہے یا ہار۔“

بیگم صاحبہ نے ان کے پر جلال چہرے کو غور سے دیکھا۔ جس پر
 غم نے اپنا سایہ ڈال دیا تھا۔ لیکن وہ کیسے مان لیتیں کہ ایسا جگمگاتا
 ہوا مہربان چہرہ بھی ہار ہوا کہلایا جاسکتا ہے۔؟

مکواشہ

ایو میرادل۔! انے میرادل کیسے سوگے مائے پتے دیسا لوز راہی۔!!
 ایو میرے ہاتھان پادان لیسے ٹھنڈے کاسے کو پڑگیتیں موٹی۔! ابھی ابھی تو میتیں
 پھوٹے پاشا کے سنگات انون کے ہولڈال کے بنان کس لئے رتی تھی۔! ابھی
 ابھی تک کا تو میتیں اپنے آپ کو ہیچ دنیا کی ایک رہنے والی معلوم پڑتی تھی۔
 پن اب میرے کو کیا ہو گیا۔! میرے میتیں یہ بہت کال سے آگئی تھی۔ کبھی دخت
 تو میتیں ویسی حرکت میتیں کری۔! پن اب۔!

میتیں تو اس محل کی وہ پالکڑی چھو کری تھی جو کوئی کو کسی مونے پر نکونیتیں
 بولی۔ جو، جو بھی کام بولے، کر دی۔ کہ کو نہ دیتی تو کوئی بھی کیا میتیں۔ میری
 بہت اچ کیا پڑتی کی ٹبرے بڑے پاشا لوگھان کو نکو بولتی۔! ایسا بھی تو دخت
 آیا کی کالے کالے راتوں کو جب کی ٹھنڈے ٹھنڈے ہوایان چل رہے ہوتے
 میتیں مزے میں تر خر پڑی سوئی ہوتی کی کوئی نہ کوئی آن کو جگا دیتے۔

”یونواب زادی اٹھ۔ گوری پاشا کے کمرے کے انگارے کلس کو کلس

گئیں۔ جا بھرچی خانے سے انگارے بھر لے کو آ۔“

اور میرے کو آتی رات کو، ایسی پکی نیند سے اٹھ لے کو جانا پچ پڑتا۔ اپنے

کمرے سے بھرچی خانے کو جائے تک کا، میرے ہاتھان، پاوان ٹھنڈے ہو ہو

کر سکڑ سکڑ جاتیں۔ پن پاشا لوگان کا حکم ملاتے نہ بتا۔ میں تو دھنا دھن

جوتے چلان کھا کھا کو بھی چپ چاپ رہی، پھر اب میرے کو یہ کیا ہو گیا تھا۔!

میرے میں یہ نئی خوت، یہ نئی طاقت کاں سے آگئی تھی! آج کے دن میرے

کو ایسا کیوں معلوم پڑا کہ میں بھی کوئی چیز ہوتی۔!!

ابھی ابھی تھوڑی دیر اول کی تو بات ہے کی بڑے پاشا بھپا بھپا ایک ایک

کام کروا لے رہے تھے۔ ہاتھ میں کاغذ لے کو انون ادھر سے ادھر، ادھر سے

ادھر دوڑ دوڑ کو آ جا رہے تھے۔

”وہ بڑا گلہ ان رکھ لیتے کیا نہیں، جو میں مراد آباد سے لایا تھا۔“

”وہ چاندی کا پاندان رکھ کیا نہیں جی، جو بڑی پاشا بھیر میں لے کو

آئے تھے۔“

”اگے وہ صراحی بھولے تو نہیں جس میں گرمیاں بھی رہو تو پانی ٹھنڈا

ہو کر نکلتا۔“

یہ سب ابھی ابھی کے تو باتان ہیں ناجی۔ پن اب کے اب میں میں

کیا کر ڈالی۔

ہندوستان بٹا سودخت میں بہت چھوٹی تھی۔ خدود تو اچھا تھا، پن

غمر چھوٹ تھی۔ اتنی چھوٹی کہ امنی میرے سر کے بالان یہ بول کر موٹا دی تھی،

کی لڑکیوں کے سر پر جھوپالا کے جھوپالا خوب لگنے بالا پنچ اچھے دکھتے۔ میرے کو میری عمر کا حساب یاد نہیں۔ پن کی اتنا یاد ہے کی محل کے مولانا کے آگے سب پاشا لوگ کے ساتھ میں بھی بیٹھا کرتی تھی۔ نہیں میں کلتے کو بیٹھتی۔ ایسا کیا میرے کو پڑھنے لکھنے کا شوخ تھا، وہ تو میری امی کو بڑا سونلہ تھا کی میرے کو پڑھنا لکھنا آجائے۔ مولانا کے آگے میں بیٹھتی تو تھی پن دوسرے بی بی لوگ میرے کو بات بے بات، کام رہو چاہے نہ رہو، البتہ کر کو اٹھا دیتیں۔ اُن لوگ شاید یہ چاہتے ہوں گے کی نوکرانی کی بیٹی ہے اس کو کلتے کو پڑھنا لکھنا ہونا۔ مگر ہوا ایسا کہ اُسی اٹھک بیٹھک میں چچ میرے کو پڑھنا لکھنا آ گیا۔ اتنا امی کے پاس گاؤں سے کوئی خط آتا تو میں پڑھ کر سنا دیتی ہوں امی کو جواب دلوانا ہوتا تو میں لکھ کر دے ڈالتی۔ امی کو بڑی خوشی ہوتی، کی مولیٰ نے وہ دن بھی دکھایا کی میری بیٹی خلم چلانا سیکھ گئی۔

ہو تو میں یہ بول رہی تھی کی جب یہ ہندوستان بٹا سو وقت میں بہت چھوٹی تھی۔ پھر بعد کو ہوا یوں کی میں ہول کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگی۔ امی کو حیرت ہوتی تھی کی نہیں پن میرے کو تو لگتا تھا کی بیٹھے بیٹھے میں بڑھتی پتخ جا رہی ہوں۔ جو چھوٹے بی بی لوگ ان میرے ساتھ کے تھے انوں تو جیسے وہاں کے دہانچے تھے پن میں تو اکدم لمبی ہوتی جا رہی تھی۔

اُنے معلوم نہیں ہمارے محل والوں کو کون ایسی ہوندی سیدھی پٹی پڑھا کی سب کے سب لوگ ان اکدم سے پاکستان پاکستان بول بول کو اُدھر چکھنے لگے۔ اب میرے کو اتنا خیال تو نہیں پن یہ لپھے طرحوں سے معلوم ہے کی جب سو ب جانے کے باتاں کرتے تھے تو کوئی یہ نہیں بولتا تھا کی میرے کو اور امی

کو بھی لے کو جاتیں گے۔۔۔ وہ دن ان ایسے تھے کی میں ہرنی کے ویسا جگو جگو اڑتی پھرتی تھی۔ ایک دن ایسا پتھر میں بیٹھے کے پھوٹے میں، کچی روش سے ہٹ کو کچے کچے امیاں توڑ رہی تھی کی اندر سے باتاں کرنے کی آواز آتی۔ برے پاشا بول رہے تھے۔

”ہم کو کیا وہاں جا کو لنگر خانے کھولنا ہے کیا۔۔۔ اب اتنے دن ان رکھے سو رکھے اب سو کو پھٹی دے کر بڑھا دیو۔“

میں کچھ بات تو سمجھی کچھ نہیں سمجھی۔ ایک خدم آگے بڑھائی اور کھڑکی سے لگ کو کھڑی ہوئی۔ پھر شاید بڑے ماموں بولے: ”تو کیا پاکستان جا کو آپ لوگاں چو لہا چکی سنبھال لے کو رہیں گے۔“ یہ بات شاید بڑے پاشا نہیں سمجھے تھے۔ آنکھوں تھوڑی دیر تو خوب چپ رہے پھر بولے:۔

”ایسی بات ہے تو جو جو نمک حلال نوکران ہیں ان ان کو سمیٹ لینا۔“ اور آگے جو باتاں چلے تو یہ سن کر میرا خون کھول کر رہ گیا کہ نمک حلالان کی فہرست میں میری امنی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔!! اؤ پاشا یہ تم کیسا باتاں لے کو بیٹھیں۔ میں اپنے آپ میں بولی۔۔۔ بھلا میری امنی سے بڑھ کر نمک حلال تم کو کہاں ملتی ہو رکھاں ملی۔! کیا تم وہ دن ان بھول گیتیں کی جب میری ان تمہارے محل میں نوی نوی آئی تھی ہو اپنے گلے کی پھڑی جیسی بکری کی طرح سے بولائی بولائی پھرتی تھی۔!! پھر یہ تیج تو تھے تا کی ایک رات کو تم نے میری ماں کے ہاتھ پکڑے، پھر ہونچا پکڑے۔۔۔ ہو اب آگے کیا بولوں۔۔۔ میری ماں آخر کو بھی غریب گھر کی تھی۔ تمہارے منکڑوں پو آ کو پڑ گئی تھی۔ اور یوں پانکڑی بن کو مشہور ہو گئی تھی۔ یہ تمہارا حیدر آباد بھی خوب ہے پاشا۔ نوابوں کا

یہ دیش اندر سے کیسا کالا ہے۔ حیدر آباد ٹیکنہ گمبے مٹی اوپر چونا۔ اب کوئی کیا سمجھے یہ اوپر سے جھم جھم چمکتا تمہارا حیدر آباد اندر سے کیسا کالا کلوٹا ہے۔ یہاں پر تو عزتوں کو تم لوگان ایسا نیلام کرے کی کوئی مولیٰ بھاجی بھی ایسا نہیں بچتا۔ میری ماں اپنی زندگی کے سارے کھان، سارے ارمان، سارے آرزوان بھول بھال کو تو تمہارے در آ کو پڑی اور اوپر سے تم ایسا بولتے کہ اُنے تک حلال نہیں۔ خوب ہے تمہاری بادشاہت۔

میری ماں قسمت کی ماری اُنے کیسا تو کر کے بڑے پاشا کے محل میں آگئی اب میں حیدر آباد کی رہنے والی ہو گئی تو میرے کورہاں کے تمام ریتان، رسماں، طوران، طرحے معلوم ہو گئے۔ یہ حیدر آباد کالج چلن ہے کی اچھے پھلے لڑکیوں کو بڑے لوگان لے لے کو پال لیتے اور انوں بے چارے پالکڑے کے نام سے مشہور ہو جاتے۔ پالکڑے بولے تو پالے ہوتے۔ میری امی بھی ویسی پنج بد نصیب تھی۔ پہلے تو بڑے پاشا دلہن سے ملے ہوا تھا کی اُنے چار پانچ مہینے کام کر لے کورہیں گی۔ کبھی اچھے طرحوں سے کام کری تو آگے ہمیشہ کورکھ لیں گے۔ مگر چار پانچ مہینے تو چھوٹ چار پانچ دنان بھی گزے نہیں تھے کی اُنے میری امی بڑے سرکار کو پسند آگئی اور ایسی ہی چمکا کر پسند آگئی کی انون میری مانی سے میری ماں کو ہمیشہ کے واسطے خرید لیتے۔ اور یوں میری ماں بھی تو پالکڑی بن کو رہ گئی۔

مگر امی کی قسمت برسی تھی۔ پہلے تو بڑے پاشا امی کو اپنے خواب گاہ میں، خالی پیران، باتھان دبولنے کو بلاتے ہے۔ پھر کیا دل میں آئی تو ہو آگے بڑھے۔ سوچنے والے سوچن گئے کی گھر کے بڑے منع کرنے کو مر گئے تھے کیا؟ تو شاید

اُن کو معلوم نہیں کی یہاں کا خائیدہ تھا کی جان بوجھ کو خدمت گزاری کو باندیاں
بندوڑیاں رکھتے تھے۔

”خدا دولت دیا تو اُس کا مصرف تو یہی ہے کی لڑکے بالے جی خوش
کر سکتا۔۔۔“

بڑے پاشا بھی اپنا جی خوب خوش کرے۔ یہ کون دیکھتا کی اپنی خوشی کے
آگے دوسرے کی خوشی بھی ہے کی نہیں۔ وہاں تو میں سب کچھ اپن ہی اپن تھے۔
میری امنی میرے سے سنا کی جب کبھی شہر میں ڈھولان بجتے اور براتان نکلتے، تو
میرا جی چاہا کرتا تھا کی میں نے بھی ایسی رچ دہن بننا۔ کوئی ڈھولان بجا بجا کو، لال،
لال جو لالے کو آنا اور میں نے سچ دھج کر پالکی میں سوار ہو کر شہر تلے ہوتے جانا ہنگر
امنی کے سنگات تو یہ ہوا کی ڈھولان بجے نہیں، برات آئی نہیں۔ کس کی شرم، کدھر
کی سچ دھج، بڑے پاشا ہاتھ پکڑا کو پہونچا پکڑے، کلائی پکڑا کو بستر میں گسیٹے اور سارے
ارمانان ہوا ہو گئے۔ نہ کوئی پوچھ گچھ کہنے کو خالی تھا، نہ ایسی بڑی بات تھی یہ، بلکہ
اگر کوئی پالکڑی یونہی ”خالی“ دکھتی تو سب چوکر یاں چھیڑ چھیڑ کو پوچھتے کی ”اُنے کیا
تیرے کو کوئی پسند نہیں کرا کی خالی گلوںم رہتی۔“ اس خالی کا مطلب اُس سے تھا جو
حاملہ نہ رہتی۔۔۔ جو خالی رہتی اسیں کوئی نہ کوئی کمی رہتی اور جو بھری رہتی وہ پاشا
لوگ کے مذاخ پر پوری اُترتی۔ میری ماں تو ابھی خدمت لاتی تھی کی اتے ہی بھری
بھری گھومنے لگی اور جب پھر سے خالی ہوتی تو نتیجے میں میں اُس کے گودی میں تھی
لوگان کہتے میں بڑی خوبصورت پیدا ہوتی تھی۔۔۔ میرے آنکھان یہ بڑے
بڑے تھے۔ گالان خوب لال لال۔ سر پر تو جیسے کسی نے ٹوپی ہی پہنا کر رکھے تھے
جھنڈولا بالان گھنے ہوئے پر رنگ بھی خوب تھا۔ کہتے میں پیدا ہوتی تو کوٹھری

میں جیسے روشنی ہو گئی۔ وہی اچ دنوں میں دلی سے بڑے پاشا کے کورفتوں کے
 بھائی آئے تھے۔ میرے کو آکے دیکھے تو بولے: ”آتی خوبصورت بچی کا نام تو بس
 سویرا رکھنا۔“ یہ بات سن کر سب اتارنے کی میٹھوں میں بلان پڑ پڑ گئیں۔ اس کے
 صبح ہوتی تو اس کو سویرا بولتے یہ کوئی لڑکیاں بالیاں کے رکھنے ویسا نام ہے کیا
 لوگاں سنیں گے تو کیا بولیں گے۔“

بولتے بھئی کی آنون شاعر تھے اور اپنے دل سے گیتان جوڑتے تھے۔ آنون
 بولے: ”آپ لوگاں تو جانواران ہیں۔ آپ کو نام کی خوبصورتی کیا معلوم۔“ یہ آٹ
 پلٹ نامان صنوبر، صندل، گل چمن، نو بہار، چنبیلی، گلاب، گیندا تو پڑنے زمانے کے
 لوگاں رکھتے تھے۔ گھردن کو زعفران کی کیا پرکھ۔
 آنون کے نام کی ابھی ہنسی اچ رتی تھی کی ایک دم سے کہتے میری ماں نے
 آنکھان کھولی اور بولی۔

”اس کا نام سویرا چ رکھنا۔ کیا معلوم اس کا نام اس کی زندگی کو ویسا چ
 بنادے جیسی کی روشن صبح ہوتی۔“
 وہ دلی والے سرکار میری ماں کے منہ سے یہ بات سن کر بولتے اتنے حیران
 ہوئے کی ایک جاہل عورت نے ایسی بات کیسی بولی۔ مگر پھر ہوا یوں کی میرا نام
 سویرا ہی رکھے۔ پہلا پہل تو سونب کو میرا نام ہو تو ادکل ادکل لکاپن بعد
 کو سائے لوگاں عادی ہو گئیں۔

میں چھوٹی تھی پن یہ دیکھتی ہو رہی تھی تھی کی میری ماں کے منہ پر کبھی ہنسی نہیں
 آتی تھی۔ دیکھنے دکھانے میں تو وہ ایسی اچھی تھی کی پہنا اور ہا کو بٹھا ڈالتے
 تو لوگاں پہچ پوچھتے کی: ”انے بھئی کوئی جاگید دار فی ہے کیا؟“ مگر میری

امنی توبے چاری پہننے اور گھسنے تک کو دوسروں کی طرف دیکھتی تھی، وہ کماں کی جاگیر دارنی تھی۔ ویسے جاگیر دار کی بیوی کو لوگان جاگیر دارنی بچ بولتے۔ اور ویسا دیکھو تو میری امنی بھی تو جاگیر دار کی، نواب کی بیوی جیسی تھی، پن اب یہ کون دیکھتا ہے۔ وہ تو آسمان پو پہونچ کو بھی زمین پر چ دیتی۔

جیسا جیسا میرے کو سمجھ آنے لگی میں یہ بات سمجھتی گئی کی اس گھر والے میں تو ہنسنا بولنا بھی اپنے بس کا نہیں۔ پاشا لوگان جو چاہ لیتیں کرتیں۔ پن اپنا تو یہی حال تھا کی خدم خدم پر دیکھ دیکھ کو چلو۔ میری امنی کے آنکھان ہمیشہ پانی سے بھرے بہتے۔ جب میں نے تھوڑا بہت لکھنا سیکھ گئی تب میں نے سوچی تھی کی اپنی امنی کی ایک کہانی لکھنا۔ امنی کو یہ بات میں بولی تو ان کو بڑی ہنسی آئی، بولے: ”بیٹا کانیان تو بڑے پڑھے لکھے لوگان لکھتے۔ اپن لوگان تو ایسے کی سیدھے سے بات کرنا بھی نہیں آتا۔ علم چلانا بھی نہیں آتا۔ آٹے پلٹا، تو کانیان کیا لکھیں گی۔“ میں بولی تھی: ”امنی میں تو اب بہت اچھا لکھنے پڑھنے لگ گئی۔ محل کے دوسرے پالکڑی لڑکیاں تو میرے اتنی اچھی بات کر سکتے۔ میرے ویسا ڈھنگ کوئی کا ہے۔“

اور یہ بات میں جھوٹ بولی بھی نہیں تھی۔ بہت دنان چھپے وہی دلی ولے سرکار آئے تھے تو انون بولے تھے: ”سویرا تو حیدر آبادی معلوم پڑتی نہیں۔“ ہمارے پاشانے پوچھے تھے۔ ”وہ کیسا؟“

تو انون نے جواب دیتے تھے کی ”حیدر آبادی لوگان جیسے غلط سلط بات کرتے انے نہیں کرتی۔۔۔ کرتی پن اتنی نہیں کرتی۔“

اتنے بڑے سرکار جو دلی سے بار بار آتے جاتے تھے، تھے تو اسی حیدر آباد

کے، پن جانے کیا بھید تھا کی ادھر انون کچھ سالان پیچھے حیدر آباد چھوڑ کر دلی جا
بے تھے۔ بولتے: انھوں کہی شادی بھی نہیں کرے۔ میری امنی یہ بات بتائی تھی
کی انون کسی پالکڑی سے عشق کرے۔ عشق کرے ہی ایسا سچا کی بولے اسی کو بیوی
بناؤں گا۔ اب دل بہلا دے پرتے کی محنت جتاتے تو اچھا بھی لگتا پن انون تو
اس کو باخاتیدہ اپنی رانی بنانے کا سوچ لے کو بیٹھے تھے۔ انون کو دادا منع کر دیتے
عشق کے ایسے پتھے ہو رخصت کے ویسے پتھے تھے کی انون سارا زمانہ چھوڑ ڈالے۔
اٹھے ہو ر دلی جا کو بس گئیں۔ پہلے تو کتے دناں پلٹے ہیج نہیں۔ پھر بہوت برساں
بعد آتے تو لوگان کہتے اُنے بالکل بدل کر رہ گئے تھے۔ تو میں یہ بول رتی تھی کی
جو دلی والا ایسے بولے کی یہ اچھی بات کرتی تو اس میں جھوٹ بات تھوڑی ہوئی۔
پھر انون کے بولے پیچھے میں آزمائی تو سچائی میں دوسرے چھو کر یاں ویسی جاہل نہیں
لگی لپنے کو۔ میں یہ سوچ کر رکھی تھی کہ سچی کہانی لکھوں گی، ضرور لکھوں گی،
مگر میری خست کی کبھی موضع نہ ملا۔ میں بڑھتی گئی ہو یہ بات بھول گئی۔
لوگان بولتے کہ کوئی کوئی بچپان ایسے رہتے کی ان کے حیران تو چھوٹے
رہتے پن اُنے دماغ بڑھون کالاتے۔ میرا بھی ویسا چ حال تھا۔ ہندوستان
بنا سو دخت میری عمر چ کیا تھی! پن غل بہوت بڑی تھی۔ پھر میں وہ زمانہ بھی دیکھی
جب کیا بولتے اس کو وہ پولیس اکشن ہوا۔ پھر تو پوسے حیدر آباد میں وہ وہ ہلو چھی
کی پوچھو نکو۔ پھر دنان ایسے بیتنے لگے جیسے شکاری کو آگے بھاگتا ہرن۔ ابھی کہ
یہاں تھا کہ ابھی وہاں۔۔۔ ان آنکھاں نے کیسے کیسے زمانے دیکھ کو بیٹھیں!
ساں پیچھے تو محل والوں نے میٹنگ جمع کر کو پاس کتے تھے کی اب جیسا کچھ بھی
خست میں نکھائے جھگتنا۔ نہ آنا نہ جانا۔۔۔ پن اب یہ نوا ہلڑ چا تو پھر سے

یہاں وہاں جگو جگو بیٹھ کو سرگوشیاں ہونے لگے۔ سب اپنے اپنے باتاں سناتے کوئی کسی کو سننے کو خالی نہیں تھے۔ پن بڑے پاشا بیٹھ کو سب کو سنائے کی ایسا آپس میں بکواس کر لینا اچھا نہیں۔ اب سوچو کون چلے کون نہیں۔

بڑے بڑے باتاں ہولتے، پھر یہ طے کرے کی آدھے لوکان چلے جانا وہاں جا کے برنسان کھولنا، ملان چلانا، کچھ کچھ تو سمجھی کرنا، پن خالی نہیں بیٹھا کی خالی بیٹھنے کا اب یہ زمانہ نہیں۔ اور جب ادھر ساکے زمینان، جاگیران حکومت کے حلق میں چلے جاتیں گے تب تو سب کو جانا چ پڑتا۔

اور پھر ایسا ہوا کی بہت سے لوکان پاکستان چلے گئیں۔ پن میں نہیں گئی۔ میں بولی میری ماں جہاں رہیں گی وہیں میں بھی رہوں گی۔ ہو راب میری ماں پاکستان چھوڑ دینا کے کرتی جھٹے میں نہیں جاسکتی تھی۔ کیونکہ نے پولس ایکشن کے کچھ دنان پہلے مر گئی تھی۔ ہو رجب ایک انسان مر جاتا ہے تو نے آنے جانے کے سارے سلسلے چھوڑ جاتا ہے۔ اُنے اب ایسے سفر پہ چلی گئی تھی کی اب واپس آج نہیں سکتی تھی۔ امنی کے مرنے کا بھیدمیرے کو نہیں معلوم پن لوکان کہتے اُن نے خود کشی کی تھی۔

میری جوانی برسات کے منہ زور بادل کے دیسی آٹھ آٹھ کو بڑھ چلی آ رہی تھی اور جدھر جاتی ادھر چرچ اُجلے ہو ہو جاتے۔ ایسے میں میں تو چڑھتا سورج ہوتی جارہی تھی جس کو ہر کوئی اپنے دل میں بھر لے کو رکھنا چاہتے۔ اور کہتے نامان گناؤں جو ایسا کر لینا چاہتے تھے! کہتے میری ماں ایک دن بھر چلنے میں دوسرے پالکڑے چھو کر یاں سے بولی: ”میں نہیں چاہتی میرے دیسا حشر میری بچی کا بھی ہو۔“ کوئی بولے: ”وہ تو ایک نہ ایک دن ہو کر چ رہینگا۔“

اس پر میری ماں نے کہی: ”تو اُس گھڑی کو دیکھنے سے اچھا یہ ہے کہ
میرے آنکھاں ڈھنک جانا۔“

اور میری ماں کے آنکھاں ڈھنک گئے۔ اُنے خود چ ڈھنک لی۔ امنی۔
پاکل تھی۔ کتنی عجیب بات کہی اُس نے۔ میرے کو اس طرح سے اکیلے چھوڑ دی۔
امنی کے مرنے کے بعد جب میں نے یہ بات سنی ہو اور ایک دن خالی پونچ
آئینہ دیکھی تو پتہ چلا کہ ماں کی بات غلط نہیں تھی۔ ابھی ابھی تو سال دو سال
پیچھے کی بات ہے کہ ماں نے میرے بالوں منڈا دی تھی۔ جب میں کیسی تھی
ہو راب —!! لہے لہے بالوں میرے پیٹھ پو جھول رہے تھے ہو رمنہ کیسا جگ جگ
جگ جگ کر رہا تھا۔ میں نے اُس وقت سوچی تھی کہ سچی اگر سویرا صبح کو بولتے تو
متین سویرا ہوں۔ مگر کیسا اندھیرا اور تاریک سویرا — بولتے ناجی کی صبح چمک
دار روشن، اور خوبصورت ہوتی — ارمانان بھری ہوتی، آرزوان بھری ہوتی
میں اوپر سے تو پیچی بھی سویرا تھی، مگر اندر سے رات تھی — رات کے دیسی
کالی اور بھیانک — نیتیں تو پھر میرے دل میں ارمانان بھری روشنی کاتے
کو نیتیں تھی —!!

ادھر تو امنی مری ادھر محل کے لوگان، آدھوں آدھ لوگان — پاکستان
چل دتین — کیسا کیسا میرا من ترسا کہی اس اکیلے پن سے، اس ڈھنڈار محل سے
اس جلانے رلانے والے گھرانے سے بھاگ کو کہیں چھپ جاؤں، پن میرے دکھی
من کو کبھی کوئی سہارا نیتیں ملا۔

یہ نکو سمجھو کہی سہارا دینے والے ملے نیتیں۔ ملے تو ضرور پن ایسے جن
کے آنکھاں، جن کے نظران زہر بھرے تھے، جن کے سانسوں مار ڈالنے والے

تھے، جن کے رگ رگ میں شیطانت اور حرام زادگیان بھرے ہوتے تھے۔
 بہت سے لوگان یہ سمجھنے کو بیٹھے تھے کی جاگیران ختم ہو گئے۔ حکومت نے
 زمینان لے لیں تو اب ان لوگان کے دماغ ٹھکانے کو آجائیں گے۔ پن ایسی
 کوئی بات نیتں ہوئی۔ وہ لوگان تو روزِ اذل تھے۔ ایسے باتاں بولنے کو بھی شرم
 آتی، پن ہم کو تو اپنے آنکھان سے دیکھنا پڑتا۔ میرے کو اپنی زندگی سے بیراگی
 ہوتی جا رہی تھی۔ اپنے آپ پورحم آتا۔ دکھ ہوتا کی یا موتی یہ بھی کیسی زندگی تو دیا۔
 اپنی زندگی سے اب تک کا تو دکھ ہوتا تھا، خود پورحم آتا تھا، پن اکدم
 سے اب میرے کو اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔ اپنی زندگی زہر معلوم پڑنے لگی۔
 میرے ساتھ کے اور بھی پالکڑے پھوکر یاں تھے۔ کچھ تو میرے ویسے ہی باپ ہوتے
 بھی بن باپ کے، اور کچھ غریبی کے مارے خریدے ہوئے پھوکر یاں تھے۔ ان میں
 سے ایک ستارہ بھی تھی۔ بولتے ستارہ خانی آسمان پوجنگاتا، ایسی اُس کی عزت
 رہتی۔ پن اُنے ستارہ ہونے کے باوجود زمین پر پھینکے گئی، بلکہ موری میرنگئے گئی۔
 ہمارے بڑے پاشا صاحب کے منچلے بیٹے حیدر میاں نے ستارہ کو ایک
 دن دیکھ لیں دیکھ لئے۔ اُس کے بعد کام نہ دھام، بہرچی خانے کے بار بار پھیرے
 کرنے لگے۔ ستارہ کی ماں بھی بہت نمک حلال تھی کی جب اُنے دیکھی کی منچلے
 پاشا آپ ہو کو یوں دولنے بن رتیں تو اُنے اپنی بیٹی کو خواب گاہ میں بھیجا ترس
 کری۔ اس خواب گاہ کا حال میں کیا بولوں آپ سے۔ نکو پوچھتے تو چ بھل
 ہے۔ وہاں پھولان بھرے سوجان تو ہوتے تھے، پن پاشا لوگان کے واسطے ہمارے
 لیے بدنصیبان تو وہاں پہونچ کو خود کو خصاتی کے چھری تلے کی گائے سمجھتے تھے
 ستارہ بھی اسی خند خلتے میں پہونچی اور خصاتی کی چھری تلے آگئی۔

پھر توستارہ کو ایک بعد ایک سبھی نے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔
 جب تک اُنے منہ بند کلی رہی، سو رہی۔ پن جب اُنے پھول کے نادکھلی تو ہر کوئی
 اپنے اپنے گلدان میں اُس کو سجانے لگے۔ کہاں تو اُنے پھول بن کے مہکی تھی کی
 ایک دن موری کا کیڑا بن گئی۔ چیاؤں چیاؤں کرتے دو تین بچے اُس کے لگے
 پیچھے جھولتے رہتے۔ اور پھر یہ مزہ کی ہر بچے کا باپ الگ، اُنے ایک کی صورت
 ایک سے نہ ملتی، سوب الگ الگ صورتاں لے کوئے۔ اور یہ تو پھر ہے چ
 کی جیسا بیجاں ڈالیں گے ویسا پھل اُترے گا۔ دو چار برسوں میں ستارہ کیا تھی
 اور کیا ہو گئی کی دیکھ کر رحم آتا۔ میں ایک دن اُس سے بولی بھی کی یہ سوب
 غلط باتاں کیوں کرتی تو اُس کے آنکھاں بھر آئے اور بولی: ”ہمے گندی مودیاں
 کے کیڑے کب تلک کا اپنے کو بچائے کو رکھ لیتے۔“

”تو ایک دن میرا بھی یہی حشر ہو تینکا۔“ میں نے سوچی اور پھر میرے کو اپنی
 زندگی سے، اپنی ہر ہر چیز سے نفرت آنے لگی۔ اُس سے اچھا تو یہی ہے کی انسان
 مرجائے۔ مگر پھر میرے کو خیال آیا کی مرنا تو بزدلی ہے۔ ڈرنا مرنا تو ڈرپوکوں
 کا کام ہوتا۔ بچے طرح ان سے زندہ رہ کر اپنے حج ہو کر زندگی کے واسطے کیوں نہیں
 لڑنا۔ مگر پھر جب سب باتاں سوچ کر اپنے اُس پاس دیکھتی تو خیال ان آتے
 کی ایسے پنجرے میں کیا بچ کو رہنا۔ جہاں لوگان ایک کونے میں اپن کو ڈال کے
 اُس پاس خوشوار شیران جھوڑ دیتے۔ ایک سے بچیں گے تو دوسرا ان کو گھیر نینگا۔
 دوسرے سے بچے تو تیسرا۔ تیسرے سے بچے تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ سلسلہ کہاں
 پر ختم ہو تینکا۔“

موتی تو بھی عورت کو کیسا بے سہارا بنا کر رکھ دیا رہے۔ پہلے تو خود چ عورت

میں ہمت کی کمی ہوتی، اُدپر سے ایسے خیدان بھی لگا دیا۔ اب میں اپنے کو بچانے کی ترکیبیاں سوچی بھی تو یہ سمجھ میں نہیں آیا کی کس کا ہاتھ پکڑوں گی جھوٹے محبتاں، خالی خولی پیاراں جتانے والے تو ہوتے مل جاتے، دل سے چاہنے والا کہاں ملتا۔ اپنا کام نکال کو دوسروں کو بے کام کر کو چل دینا تو سب کو آتا پن وہ محبت کرنے والا دل کون سے کمنے میں بستا کی جو اپنے کو روتا دیکھ آنسو کے خظروں کی جگو خون بہانے کو بیٹھ جاتا۔ عورت کے دیوانے تو سب ہوتے۔ اپنا پہلو گرم کرنے کو سب سوچتے۔ پن اس کی زندگی، اس کے دکھ درد کا خیال کون کرتے؟ یہ محل والے۔ یہ درندے۔ یہ شیران؟

”بھاگ جاؤں۔“ میں نے اپنے دل سے پوچھی۔! پھر یہ خیال کری کی بھاگ کو اتنی بڑی دُنیا میں جاؤں گی کدھر۔ دُنیا میں بھی تو آخر بُرے لوگان بستے ہوں گے۔ پھر۔۔؟

”بھاگنا ضروری نہیں ہے کچھ۔“ میں نے اپنے دل کو سمجھا دی۔ ہمت سے رہے تو چ سب کچھ ہے اپنا من میلا رہے تو لوگان بھی آنکھیں بھر بھر کو دیکھتے۔ اپن سلامت رومی کی چال سے چلے تو کسی کے باپ کا بجال نہیں ہوتی۔ کی ایک نظر بھی پھینک کو دیکھے۔

زندگی ایسے گزرتی تھی۔ نامراد، اندھیاری۔ نئی اکدم سے میرے کلے راتاں صبح میں بدل گئے۔

محل کے آدھوں آدھ لوگان پاکستان چلے گئے تھے۔ کبھی کبھار وہ لوگان چلے کو آتے ہرچ تھے۔ اب کے منچلے پاشا، بڑے چچا، چھوٹے پاشا آئے تو جیسے محل بھرے میں بہار تارچ گئی۔ یہ لوگان اب کے آئے تو بولے کی اب سوب

کو پاکستان لے جانا ہے، کیوں کہ اب یہاں پوزندگی میں کوئی مزہ باقی نہیں رہا۔
 اب میں ابھی خاصی ایک جوان لڑکی تھی۔ ادھر ادھر نکل جاتی تو ایک کو ایک
 مرد میرے کوچ گھورتے لگتا۔ ویسے تو لوگ ان خود بولتے کی جوانی اپنی جگہ خود پر
 ایک خوبصورتی ہوتی، اُس پر خوب صورت چھو کری کی جوانی — اما محل میں بہار
 ناچی تو ناچی میرے دل میں بھی ناچی — زندگی میں پہلی بار تھی کی کوئی نے
 سچ سچ میرے کو پیار بھری آنکھوں سے دیکھ کر مسکرایا۔ ایسے پیار سے مسکرانے
 والا وہ عباس تھا۔ جب پولیس اسٹیشن کے تحت سب لوگ ان پاکستان گئیں
 تو اُنے بھی ساتھ گیا۔ جب کو اُنے ایک بچے کے مانع تھا، پن اب تو ایک اچھا
 خاصا مرد و ابن گیا تھا۔ اور کیسا طرح دار اور بانکا مرد و کی دل آپو آپو اسکی
 طرف کھینچتا۔ پیار سے مسکرانے کو دیکھنے کے سوا اُنے کبھی میرے سے بات تک
 کرنے کی کوشش نہیں کرا۔ یہ نگو سمجھو کہ ایسے سے محبت نہیں رہتی کی بات تک
 تو نہیں کرا اور بول رہی کہ محبت کری تھی۔ سچی چاہت والے کا یہی روپ ہوتا۔
 چار چھ سال اُنے پاکستان رہ کر کیا آیا کی اُنے اپنا لب لہجہ، بات چیت، چال
 ڈھال سب بھول بیٹھا۔ اب اُنے بات کرتا تو ایسی جیسے چھوٹی پاشا لوگان
 کو ارد پڑھانے والے ماسٹر کرتے تھے۔ کسی کو کوئی کام سے پکارتا تو ایسا کی آواز
 کان میں نرم نرم لگتی — چلتا تو ایسے کی زمین ہدرتی اور سینہ ایسا تناہوا کی جیسے
 کچے نہیں جتے گولیاں کھانے کا حوصلہ ہے۔

عورت کا دل بھی میں بولتیوں کیا دل ہوتا کی جہاں پیار کی ایک ذری
 جھک بھی دیکھا وہیں جھک گیا۔ اب عباس کے خیالوں آتے تو صرف عباس ہی
 رں میں دماغ میں نہ آتا بلکہ ایک گھر، ایک باغ اور کھل کھل کتے بچے بھی آپو

آپ چلے آتے۔ پچے۔ جو الگ الگ صورتاں نیتیں رکھتے تھے۔ کسی کی ناک عباس کے دیسی تھی، کوئی پینے آنکھاں عباس کے ویسے لایا تھا۔ کسی کے چلنے کی ڈھب عباس دیسی تھی اور کوئی تو چھوٹا سا عباس ہی تھا۔ بس۔۔۔ میں تو وہ پھول تھی جو ایک ہی گلخان میں سمجھنے لایا تھی۔

اب تک محل میں جو سارے لوگ ان تھے انہوں نے ایسے نیت کے، نظر کے برے تھے کی کبھی پینے کو پانی بھی مانگے تو جھٹ آنکھ مار دیتے۔ کبھی پانی کی تھالی دینے کو اٹھی تو ہاتھ پکڑ لینے کو تیار ہو گئے۔ مگر عباس۔۔۔ آنے تو بات بھی کرا تو نظر جھکا کر۔

ایک دن بیچے میں میں بڑے پاشاکے سر ہاتھ رکھنے کو گلاب کے پھول تو لڑتی تھی کی گچ سے ایک کانٹا انگلی میں گھس گیا۔۔۔ سی، کر کو میں اپنی انگلی منہ میں ڈال لی۔ پتہ نیتیں وہاں عباس کھڑا تھا کی میری آواز سن کر آیا۔ آیا اور اکدم میری انگلی پکڑ لیا۔

”دیکھ کر کام کیا کرو۔ اگر ابھی زخم بن جاتا تو۔“

میں حیرت اور شرم سے ڈوب مری۔۔۔ آتے کیسی دہلی دہلائی زبان میں بات کر رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو اس کے سامنے ایسی حیر لگی۔ دل بولا۔ ڈوب مردوں۔۔۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لی۔۔۔ ”نگوا اللہ۔۔۔ میں خود سے بولی جو اتنے لپھے آدمی سے کیا بات کر دیں ماں۔“

وہ کچھ دیر تو کھڑے رہا پھر بولا۔

”لاؤ تمہاری انگلی پر پٹی لپیٹ دوں۔“ اور ایسا بول کر وہ اپنی دہلی

کا کونہ پھاڑنے لگا۔

”نگواٹھ۔“ میں گھبراہٹ میں بولی۔ ”اپنی دستی نگو پھاڑو۔ ایسا کیا
 بڑا زخم میرے کو لگ گیا۔“ میرا دل جیسے رونے لگا۔ میں بولی: ”تم اتنے سے
 زخم کو دیکھ کو پٹی پسیٹ دے ریش اور جو میرے دل میں اتنے سائے زخما پٹھے سو!“
 وہ ذرا دور ہٹ کر بولا: ”میں تمہارے سائے زخموں پہ اپنے پیار کا مرہم
 رکھ دوں گا۔ بولو، مجھ سے بیاہ کر دو گی۔“

یہ بادلان، یہ ہوایان، یہ پھولان، یہ بانفان جیسے سوب کے سوب جھوم
 جھوم کو لہرانے لگے۔ ہم دونو کو کھڑے کتنی گویا ہوئی تھی بن میرے کو ایسا لگا
 کی ہم کتنے زمانے بیت گئے کی ہیں تھے۔ میں نے مراٹھا کو اس کو دیکھی جانے
 کب تک دیکھتی رہی ہو پھر جیسے میں کسی جادو کے اثر سے آگے بڑھی اور جا کو
 اس کے سینے پو اپنا سر ٹکا دی۔ اس نے جھک کر میرے منہ کو دیکھا۔

”تم کتنی بدل گئی ہو سویرا۔ تم کتنی ابھی ہو گئی ہو۔ تم تو سچ پچ میری
 زندگی میں صبح بن کر آ گئی ہو۔“

اور اس نے دھیرے سے جھک کر میرے کو اپنے ہاتھان میں سمیٹ لیا۔
 اس ایک گھڑی میں ہمارے سائے دکھان ایک ہو گئے، سکھان ایک ہو گئے۔
 ہم دونوں اتنے خریب ہو گئے جیسے کبھی دور اچ نیتیں تھے۔

پہلے تو عباس کراچی جا کر اپنی تعلیم پوری کرا، اس کے بعد اُنے پاشا لوکان
 کے حساباں کتاباں کی جانچ پڑتال کرنے لگا۔ اس کے بغیر تو اب محل والوں کا
 پتا بھی نہیں ہلتا تھا۔ وہاں کراچی میں کہتے ہوتے سے لڑکیاں اس پر لٹو ہوتے
 ہوت سے لڑکیاں اس سے عشق لڑانا چاہے، پن اُنے کسی کو خاطر میں نہیں لایا۔
 اب اُنے بولتا تھا کی بچپنے سے جب کی اُنے میرے کو دیکھا تھا، میرے ماتھ رہا

تھا، میرے کو چاہتا تھا۔ اُنے بولتا میں اتنے بڑے بڑے بستیاں گھوما، ایک ایک لڑکی سے ملا، پن وہ بات کسی میں نہیں جو میرے میں ہے۔

میری زندگی اب تک کا بڑی بڑی گزری تھی، کوئی خوشی نہیں تھی، کوئی
 سکھ نہیں تھا۔ بس ہر وقت پاشا لوگان کے جھڑکیاں اور بات بے بات ڈانٹاں۔
 ایک دن بھی تو ایسا نہیں ملا کی میتیں ذرا مسکرا ہی لیتی۔ ویسے مسکراتا چاہتی تو مسکرا لیا
 بھی بہت مل جاتے، مگر میتیں ویسی لڑکی نہیں تھی کی پیسوں کے بدلے میں خوشیاں
 خریدتی۔ اتے زمانے میرے پسے گئے، کتے پاشا لوگان ایسے تھے کی میرے
 کو طرح طرح سے دغا دینا چاہے پن میں تو ایسی تھی کہ کبھی کسی کے خواب گاہ میں
 پھنکی تک تو نہیں۔ ہزار مونھے ایسے آئے کی میتیں بال بال بھی۔ لوگان بولتے
 کی انے کیوں ایسی خود سر ہے۔ یہ میتیں سوچتی کی جن کا کھاتی ہے، انون
 کے کام آنا چھ پڑتا۔

پن میتیں تو یہی بولتیوں کی دنیا میں بدی نیکی سب عورت کے ہاتھ میں
 ہے۔ اُنے کبھی عورت کی مرضی نہیں تو کسی کے باپ کی ہمت نہیں پڑ سکتی
 کی ہاتھ بھی لگا سکے۔ مجبوری کو میتیں کب نہیں مانتی، مگر عورت تو وہی
 کی مجبوری ہوتے بھی اپنی عزت کا ناؤ کو صاف کھلے جائے، نہیں تو ایسے
 سے موت کیا بڑی ہے۔ یہ مرد دل کو دلیر بنانے میں سارا ہاتھ ان عورتوں کا رہتا
 اڑتے اڑتے یہ خبر پاشا لوگان کے کاتان تک پہنچی کی عباس ہو رہا
 سویرا کا میل جول بڑھ رہا۔ اب یہ اتنی اہمیت کی بات تھی تبھی نہیں
 مگر بات یہ تھی تا کی میتیں کسی کو منہ نہیں لگاتی تھی، سواب کیسے ایک دو لڑکی
 کے مرد دے پھر بچھ گئی۔ میتیں، ان لوگان سے کیا بتاتی کی اُنے دو کوڑی کا

بھی تھا تو میرے واسطے دو لاکھ کا تھا۔ کیا محبت پیسے سے کرتے کیا؟ دل دیکھتے جی دل۔۔۔ پن ان لوگان کو دلاں کی کیا خبر۔ یہ لوگان تو بس پیسے کے غلامان ہیں۔۔۔ چھی۔۔۔ مٹھی پڑو ایسے نیتان پو۔

میتیں عباس کی رانی تھی تو اپنی جگہ پو تھی۔۔۔ پن ان پاشا لوگان کی تو غلامی تھی۔ ایسے موندے تو آتے پچ تھے کی میرے کو ان کے کاماں کرنے کو انوں کے کردل میں جانا پڑتا۔۔۔ ایسے میں ان لوگان کا بس نیتیں چلتا تھا، کی میرے کو اٹھا کے کچا کھا جاتے۔ میں کیسی مگن اور خوش تھی کی چلو اب میرا بھی نصیب خدائے کھولا۔۔۔ ورنہ یہ ڈاکو آں تو میرے کو اڑ لے جاتے۔

اب ہمارے سوب کا پاکستان جانا بالکل طے ہو گیا تھا۔ عباس نے بول دیا تھا کہ اپن پاکستان جا کو جھٹ پٹ شادی کر لیں گے۔ میں نے بولی، یہاں پر چ کیوں نہیں کر لیتے۔ جتنی جلدی ہیں تمہارے ساتے میں آگئی اسیا اچھا۔۔۔ پن عباس بولا کی اُنے میرے کو ایسی دیسی دہن نیتیں بنانا چاہتا اُس کا پاکستان میں بہت روپیہ جمع تھا۔ وہ وہاں چل کو نور دار شادی کریں گا۔ ایسا اُنے بولا۔۔۔ اُنے بڑے بڑے باتاں سوچتا تھا کی اپن ایسا کریں گے، دیسا کریں گے۔ دہم دونوں جلدی سے جلدی پاکستان پہونچ جاتا چلتے تھے، پھر گھر بھی الگ لے کو رہیں گے۔

پھر سوب لوگان پاکستان جانے کے تیاریاں کرنے لگے۔ اچھے بڑے سامان کی بیج باج ہونے لگی۔۔۔ رونے دھونے ہوتے، بے ہوشیاں پڑتے ہوو روپیہ حاصل کرتے جاتے اور ساتھ ساتھ سامان کی باندھا بوندھی بھی چلتی بیج رہتی۔

”یہ چیز لاؤ۔“

”وہ چیز لاؤ۔“

”وہ پاندان اٹھا کولا۔“

”لگے وہ گلہ ان سنبھال کولا۔“

اس دن یہ حکم احکام جاری تھے کی اُدھر سے کوئی آ کو بولے کی میرے کو اُدھر چھوٹے محل میں چھوٹے پاشا بکارتیں — انون کے ٹھاٹ باٹ نرولے تھے۔ انون کا سامان بھی سوب لوگان سے الگ تھا — وہ اکیلے میں باندھا بوندھی کر رہے تھے کی میتیں جا پہونگی۔

”تو بھی پاکستان چل رتی کیا۔“ وہ اپنے کوٹ کی گھڑی کرتے میں بولتیں۔

”جی ہو۔“ میں خوش ہوئے کو بولی۔ ”میتیں تو اپنا سوب سامان

بھی بند ہونی۔“

”اچھا۔!“ انون کچھ دیر رک کو بولتیں۔ ”اور پھر وہاں تیسری

شادی ہو جائیگی نا!“

میں شرما کو سر جھکانی تو کہے: ”ہے بڑا یہ خوش نصیب عباسیہ۔“

تازے پھول پوتا تھا مارا سال۔“

میرے کو بڑا غصہ آیا — یہ سال والا کاسے کو تو بھی بول لے رہیں انون

دبی زبان کر کو بولی: ”انے کیا بگاڑا آپ کا۔“

جھٹ ہنس کو کہے: ”کچھ نہیں — یونہی بات دلیسی بات بولا میتیں“

بھر رک کو بولتے: ”اچھا سویرا پاکستان چل کو ہم تیری شادی آتی دھوم

دھام سے کریں گے۔

”آپ تو بہت اچھے ہیں پاشا۔ کوئی تو میری شادی کا نام بھی نہیں سننے کو خالی اور آپ بول رہیں شادی دھوم سے کریں گے۔“
 ”اُنوں میرے قریب آکوڑکے۔“ کیوں نہیں۔ آخر تجھ پر ہمارا کچھ حج لگتا کہ
 نہیں۔“

”میں جیسے احسان میں ڈوب کر بولی: ”کیوں نہیں پاشا، آپ ہرچ لوکان
 تھے کہ میرے کو پالے، آپ سے بڑھ کر کس کا حج ہو تین لگا۔“
 ”تو وہی تو میں بواتا ہوں کہ اپنا حج کیوں نہ لیوں؟“

اب جو میں نے ہولڈال کے بنان کتے کتے سر اٹھا کو اُنوں کی صورت
 دیکھی تو سارا معاملہ جیسے میرے سمجھ میں آ گیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ بھول
 اپنے اصل روپ میں عباس کے آنکھ میں جھلکے۔۔۔ کیوں نہ آگاہی اس کو
 مسئلہ دیوں۔۔۔ میں گھبرا کر بھاگتا چاہی تو دیکھی چوٹے پاشا سامنے پہنچ۔
 کھڑے ہنس لے رہے تھے۔!

آخر وہ گھڑی تو میرے غدر میں لکھی تھی پہنچ کی جس سے بچنے کو میری
 امنی زہر کھائی تھی۔ پنجرے میں شیر بھی تھا اور آنے بے بس شکار بھی! اُنوں
 میرے قریب آکوڑے۔

”یہ گالوں کو چومنا تو میری برسوں کی خواہش ہے۔“

میرا خون سن سن کر لے کو اونٹنی لگا۔ ہوں، تو انے ابھی اسچ واسطے
 میرے کہ پھنسا لے رہے تھے۔ میرے دماغ میں اکدم سے میرے عباس
 کی پیاری صورت آئی، اور اس کی صورت کے ساتھ جیسے میرے دل میں نئی

خوت آگئی۔۔۔ ہور میتیں جو برسوں سے پاشا لوگان کا چھوٹے سے چھوٹا حکم
بھی مانتی سنتی چلی آتی تھی، اس گھردی تن کو بولی۔

”یہ تو عمر بھر بھی نیتیں ہونے کا۔“ ہور ایسا بولتے پتھ میرے میں ساری
دینا کی طاقت آگئی۔ ”میری ماں جیسی زندگی گذاری ویسی تو میں ہرگز نیتیں
گزاروں گی۔ میرے کو سترہ مرد نیتیں ہونا۔ میرے کو ایک ہی ہونا، پن بخت
کرنے والا ہونا۔ ایک چھوٹا سا گھر ہونا، جس کی میتیں مالکن رہنا۔ کسی کا ڈ
نیتیں ہونا، ڈیکانیتیں ہونا۔“

میرے باتاں سن کو ایسا معلوم پڑا جیسے انون کو غصہ آگیا۔ انون آگو
ہی آگو بڑھے چلے آئے۔ میں پیچھو ہوتے ہوتے دیوار کو جالگی۔ اب لئے
میرے سامنے ایک اسٹول پر پاؤں دے کو ایسے کھڑے ہو گئیں جیسے سینما
میں کام کرنے والے لوگان ہوتے۔۔۔ میرے منہ پوٹھک کے ابھی انون
بکے نیتیں کیا کرتے تھے کی میتیں زناٹ سے ایک چانٹا انون کے منہ پو جڑا
انون میرا دہی ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتیں۔۔۔ میتیں پنجہ منہ تک لے جا
کو ایسی زور سے کاٹی کہ خون کا کھارا کھارا، کڑوا، کیلا مزہ میرے منہ میں لے تر
گیا۔ ”سی“ کر کے انون اپنا ہاتھ کھینچ لئے۔ پن ابھی ان کی ہوس تو
باخی تھی! میں ادھر ادھر دیکھی کی اپنے بچاؤ کے واسطے کیا تو بھی کروں پن
کوئی بات عقل میں نیتیں آرہی تھی۔ دل تھا کہ اجاڑ دھڑ دھڑ کرے جا رہا
تھا۔ ”مٹھی پڑو یہ دل پو۔“ میتیں دل ہی دل میں بولی۔ عین موخے
پہ دھڑک رہا تھا۔

اکدم تیزی سے ایک ترکیب میرے کو سوجھ گئی۔ پن بات بڑھوڑ

گئی تو وہ کچھ زیادہ کم ہو گیا تو میرے کو جیل کی ہوا تو میتیں کھانے پڑیں گے۔
 پن میتیں بھی سوچی کہ عزت جانے سے اچھا تو یہ ہے کہ جیل ہو جاتا۔ جیل
 سے تو پھر بھی کبھی چھوٹ کو آجائیں گے۔ عزت گئی تو کان سے لائیں
 گے۔ یہ سارے ہمتان میرے کو عباس کے خیال نے بندھایا۔

”میتیں تمہارے پاؤں پڑتی حضور، میتیں تمہاری غلام پاشا۔“ ایسا بول
 کو میتیں نیچے اُن کے خدموں میں ٹھکی اور ایک پاؤں جو زمین پر تھا، اُس کو
 پکڑ کر ایسی زور سے کھینچی کہ اُنوں کا سارا تول پیچھ کو چلا گیا۔ دھڑک
 کو اُنوں تالو کے بل گرتیں اور دوسرے گھڑی میتیں تیزی سے باہر کو بھاگی۔
 دروازے میں سے نکلتے ہیں میتیں پیچھ کر کو ایک بار بھی نہیں دیکھی۔ بس ایک
 خوشی تھی کہ میتیں اپنی عزت برباد ہونے سے بچاں۔ آخر کو میتیں اپنے
 عباس کی عزت بچائی نا۔“

حویلی میں کیسی کی ہول رول پچ گئی۔

میتیں بیچے میں آکڑ کی۔ دم پھول دیا تھا، سانسوں سانس ہوئی
 جا رہی تھی۔ میرے میں یہ ہمت کان لے آتی۔ میتیں کتے بڑے بڑے
 ہمتاں کمری۔ تھپڑ میں ماری، گزشتہ میتیں نوچی، خون میتیں نکال دی، ہور
 ٹانگ کھینچ کر تالو کے بل میتیں الٹ دی۔ اُنوں کو پورا کا پورا آپٹ دی۔
 پن اب حویلی میں جو ہول پچ رہی، وہ بھی ایک الگ ختمہ ہو رہا۔

بڑے بڑے بوٹاں کھٹ کھٹ کرتے۔ امین لوگاں (پولس) ادھر
 ادھر گھوم لے رہیں۔ کتے اُنوں چوٹنے پاشا ختم ہو گئے۔ اب میرے گلے
 میں شاید پھانسی کا پھندا پڑیں گا۔ پڑنے دیو۔ میں وہ پھانسی کا

پھندہ چڑھا دے گا کالی پوت کا لچھا سمجھ کو پہن لیوں گی۔ کالی پوت کا لچھا سہاگ کی نشانی ہوتا۔ لٹکوں کو اسی واسطے تو لچھا چڑھاتے تاکہ بولتے انے دوسرے کے نام پوچھتا ہ تو میں بھی تو یہ کام عباس کے واسطے ، اپنے سہاگ کے واسطے اچ کر لی نا۔ ہر کبھی میرا مولی میرے پوہرہاں رہیا ہر میں جیل جانے سے بچ گئی تو میں تو ہوں اچ ، اپنے عباس کی۔ میرے کو کاتے کا ڈر۔

میرا لڑتا دل آپ ہو ہو دھڑکنے پو آگیا۔ میں سوچی میرے کو کاتے کو اتنا ڈر نا ہونا۔ میں خونی کاتے کو سمجھوں خود کو۔ میں اپنے کو گنہ گار بھی کاتے کو سمجھوں۔ میں کیا آنون کو چپ کا چپ مار ڈالی کیا۔ میں اپنی عزت بچانے کو یہ سب کر لی نا۔ کاتے کے واسطے کی میں نیا کے سب شریف عورتاں جیسی عورت بننا چاہتی ہوں ستر دھکڑے نہیں کرتی جو اپنی عزت نہیں لٹانا چاہتی ، جو ایک بھوتی بھوت محبت کرنے والا شوہر ہونا بولتی۔ جو اپنے گھر کی مالک رہنا چاہتی۔ جو کچھ بچ کرتے بھولے بھالے بچے چاہتی ، جو سوب کے سوب ایک دوسرے سے شکل و صورت میں ملتے دلتے رہنا ، ہر آپس میں شکل صورت جیسی ملتی جلتی رہتی جب کی سب کا باپ اچھ ہوتا۔

نکو اللہ۔ میرے کو رنگارنگی صورتاں کے بچے نکو۔

میں آپ سے بولی ناکی میں تو وہ پھول تھی جو ایک ہی کلدان میں

سمجھ لاٹھ تھی۔

نصیبے والی

نواب صاحب خطا پڑھ کر بے حد خوش ہو رہے تھے۔

”..... سلطان میاں حویلی والا مندرمہ بار گئے۔ بی پاشا اپنے

میاں پر جو پاندان کے خرچے کا دعویٰ دائر کئے تھے، وہ انوں جیت لئے۔

اس واسطے آج کل انوں بے حد خوش ہیں۔ ہزار روپے مہینے کے حساب

سے جوڑو تو سمجھو کی اب انوں اپنے میاں کی پوری جائیداد ہی ہتھیا لے

جیسا کہ ہیں۔ جو میں آپ کو لکھی تھی کی نیٹیں (اجارہ دماغ پوسٹی پڑ کو جاؤ

یاد چ نیٹیں رہتا کی پہلے خط میں کیا لکھی تھی کیا نیٹیں۔ اس واسطے کبھی ایک

بات دو دفعہ لکھ دیا کروں تو آپ سنسی نکوٹا ایا کرو) کی مبارک بیگم کو آٹھ

اکتوبر کے بعد خداوند تعالیٰ لڑکا بھی عنایت فرمادیئے۔ عینجے کی دعوت

ہم سب کو کہی آئی تھی۔ میں ہاتھوں کو سونے کے کڑے دی۔ بس۔

پوچھو نکو کتی سہی ہوئی۔ سوب بولنے لگے کی اب تو بیٹا ہوا۔ اب تو تم سے کم کڑے چوڑیاں مت دیتا تھا۔ مگر میں بولی سونے کی تھکڑی خوش نصیباں ہی پہنتے۔ ایک مزے کی بات آپ کو بتانا بھول چکی گئی۔ آٹھ بیٹیاں ہونے سے مبارک بیگم اب لڑکی کی خبر کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ ٹیبل پو پڑے پڑے انوں ڈاکٹر ٹی سے پوچھتے بھی نیٹس تھے کہ میرے کو کیا ہوا۔ خود ہی بول لیتے تھے۔ ”او نہ لڑکچ ہوئی ہوئیں گی۔“ اسی مارے ابھی بھی نیٹس پوچھے، جب ڈاکٹر ٹی خود اٹھا کو بتائی کہ لڑکا ہوا ہے تو انوں دو گھنٹہ کی زچہ اٹھ کو کھڑے ہو گئیں۔ پھر ڈاکٹر ٹی خود پکڑ کر لٹا دی۔۔۔۔۔“

ایسا مزے کا خط تھا اور یہ تیسری بار تھی کہ خدمت گار کھنکار کھنکار کر انہیں مخاطب کرنے کی برأت کر چکا تھا۔ مگر وہ بری طرح خط میں ابھے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ آپ کو شاید یہ بات پتہ چلی کی نیٹس کہ ممانی اماں کی چھوٹی بیٹی کی نسبت طے ہو گئی۔ اللہ اپنے کو خود اتنا نوازا کی کسی کا دیا لیا آنکھوں میں نہیں بھرتا۔ پر سمدھیانے والے پیروں میں سونے کے سوا سیر کے پازیاں لائے تو یہاں سب پٹا پٹ دیدے مارنے لگے۔ میں تو ہوا اٹھ کو گری کے بہانے آنکھ میں چلی گئی۔ اب یہ نکو پوچھو کی کہ کیوں۔ ایک بات ہو رکھنے کی رہ گئی۔ میں ایسا سنی کہ بڑے چچا اپنی کنواری بیٹی کو ڈاکٹر ٹی بنانے کے واسطے حیدر آباد بھیج دیئے۔ کیسا خراب زمانہ آگیا مولیٰ۔ اب ذرا سوچو انے کنواری چھو کر یکتے برے برے باتاں شادی سے پہلے اچ دیکھ لیں گی۔ خیر اپنے کو کیا۔ ہو تو گاؤں میں سب خدا کا فضل ہے

کتنے فضلاں اب کی خوب بہاؤ پر ہیں۔ خاص طور سے چاول پھلی، دھان
تو خوب پھلا ہے۔ میں تو بھوت دناں ہوئے ڈیوڑھی سے باہر خدم بھی
نہیں نکالی۔ گھٹیلے مارے جان عذاب میں ہے اجاڑ۔ آپ کیسے ہیں
لکھنا۔ ہوریہ بھی لکھنا کی آپ کو میرا یہ ”روزنامہ اخبار“ پسند آیا کی نہیں۔
آپ کی تابع دار

بیگم صاحبہ

یہ بڑے مزے کی بات تھی کہ تابع دار لکھنے کے باوجود بڑی ذہین
ہمیشہ خود کو بیگم صاحبہ لکھتیں۔ نواب اپنی ان بیگم کی تحریر کے دیوانے
تھے ہنسی سے ان کے خط کو ”اخبار“ کہا کرتے کہ دنیا جہان، بھرے خاندان
کی خبریں ان کے خط سے مل جایا کرتی تھیں۔ وہ بیماری کوئی ایسی بڑی
نہیں ہوئی تھیں۔ یہی پنتیس، چالیس کے پیٹے میں تھیں لیکن گھٹیلے مار
رکھا تھا۔ انہوں نے اپنی بیماری کی وجہ سے گاؤں آباد کر لیا تھا اور نواب
کو کھلی چھٹی دے گئی تھیں۔ ساتویں تک تعلیم پائی تھی۔ اس تعلیم کا بدلہ
اب یوں چکاری تھیں کہ مار خط پہ خط پورے خاندان میں دوڑ لگے جاتیں
نواب صاحب تو کہتے کہ شراب کانشہ ایک طرف اور بڑی بیگم کے خطوں کا
سرور ایک طرف۔ جب بھی گاؤں سے ان کا خط آتا وہ بار بار پڑھتے
اور رطف اٹھاتے۔ مگر آج.... کمبخت پھر کھنکارا۔

انہوں نے سرگھما کر غصے سے دیکھا اور کہا ”یہ کیا نامعزولیت ہے؟“ مگر
گردن گھماتے ہی جیسے ان کی آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں۔ یہ لمبی قطار سوکھے مارے
تخت زدہ کسانوں کی... خیر قطار کو مارو گولی۔ قطار کے کونے پر کوئی اٹھارہ

سال کی جوان اور بھرپور فصل اہلہا رہی تھی۔ پچ پچ کے گیہوں کا چمکتا رنگ نئی کوری صراحی کی طرح سنسناتا بدن کہ جس پر پانی کا پہلا چھینٹا گرے تو سن سن بولنے لگے۔ کمر ایسی کہ کروٹ سے لیٹے تو جسم میں ایسا گڑھا بیچ میں پڑ جائے جیسے اس میں چوڑی بھی ڈھیل غافل ہو جائے گی۔ اور کم بخت کے بال! ساری زندگی حیدر آباد میں گزری۔ عمر بھر دیکھتے رہے۔ یہ مائیں، اہلیں۔ خواہیں، کینز۔ چاول کے ساتھ اٹلی کا کھٹا "کٹ" کھا کر عمر گزارنے والی مخلوق کٹ پرکاتے سے جو اٹلی کے پھوک پنج رہے تھے اسی میں گیہوں کا تھوڑا آٹا ملا کر لٹی جیسی "اٹکل" بنالی اور سر میں تھوپ کر نہا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ یہی ان کا شیمپو ٹھیرا۔ اور اسی نامراد شیمپو سے کیا جھکا جھول بال بڑھتے تھے۔ مگر یہ بھی تو انہیں میں کی ایک نظر آ رہی تھی اور اس کا شیمپو بھی یہی اٹلی کے پھوک کا "اٹکل" رہا ہوگا۔ لیکن یہ بال تھے کہ چڑھتی ندی۔ ماتھے سے شروع ہوئی تو سیدی اڑیوں تک جا اتری۔ تیل سے بیگانہ، الجھے ہوئے، خاک دھول میں اٹے، مگر آف! آف! سرد موسم کے باوجود انہیں اس قدر شدید گرمی لگنے لگی کہ وہ نپکھا نپکھا چلا اٹھے۔ خدمت گار نے ہڑٹا کر فرشی جھالردار نپکھے کی زر کار ڈور تھام لی۔ دھیرے دھیرے ان کے حواس واپس آنے شروع ہوئے۔ حوصلہ پا کر خدمت گار نے عرض کی: "حنور کی خدمت میں مختار صاحب حاضر ہونے کو پوچھ رہیں۔" مختار عام اپنی سنہری کلاہ سر پہ جاتے ہوئے برآمد ہوئے اور بے حد شائستگی سے، آواز کو اس قدر سر بلایا کہ کہہ نچوں کی سی ڈھب آگئی، سر جھبکائے جھبکائے بولے "ہر سال کی طرح اس سال بھی دیگن بھر کر قحط زدہ کاشتکار حنور کے در پہ مالی امداد کے بھروسے آئے ہیں۔"

نواب صاحب نے ذرا کی ذرا سراٹھا کر نگاہ ملا کر دیکھا۔ مونہہ سے کچھ
 بولے نہیں، مرطاب یہ تھا کہ بیان جاری رہے۔ اور بیان جاری رہا۔

”ان میں سے چند ایک تو حضور کے دولت کردے پر سال بھر غلامی کے
 عوض صرف پیٹ بھر کھانے اور تن بھر کپڑے کے طلب گار ہیں اور چند...“
 ”ہور چند۔“ نواب صاحب نے اچانک بات کاٹ دی۔

”اور چند زمینات چاہتے ہیں۔ بہت ہلکی شرائط پر۔“
 تنی ہوئی گردن ایک ”ہم“ کے ساتھ نیچے جھک گئی۔ تین بار جھکی اور
 مطلع صاف ہو گیا۔ اب وہاں صرف مختار عام رہ گئے تھے، جو فحاشی
 کی حدود کو اس قدر شدت سے پہنچ چکے تھے کہ دوسرے ہو کر رہ گئے تھے۔
 ”زمینات مانگنے والوں کو زمینات دے دیجئے۔“

”بہتر۔“

”اور حصت ایک بات بتائے۔“

”جی سرکار۔“

”سال بھر غلامی کر۔ نے والوں میں عورتاں زیادہ ہیں یا مرد۔؟“
 ”جی حضور، عورتیں تعداد میں بڑھ کر ہیں۔“ مختار عام نفیس لکھنوی
 لہجے میں فرما رہے تھے۔ لیکن چند خواتین اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ ہیں۔“
 ایک لمحے کے توقف کے بعد نواب صاحب نے پوچھا۔ ”اور وہ جو
 کوری صراحی کی طرح سسنا رہی تھی، کیا وہ اپنے کہہ بار کے ساتھ آئی ہے؟“
 لیکن یہ جملہ مختار عام نے نہیں سنا۔ کیونکہ یہ جملہ دراصل صرف حضور کے ذہن نے
 سوچا تھا۔ زبان سے ادا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس لئے اپنی آواز سے

انہوں نے پوچھا۔ ”اور وہ گندی سی چھوکری جس کے ٹوڑیاں اس کے ایڑیوں کو چھو رہے ہیں، اُسے؟“

مختار عام لہجے میں گھاگھیاٹے۔ ”حسنو خادم کو ابھی اتنی تفصیل نہیں معلوم ہے۔ اجازت ہو تو یہاں بلالوں؟“

تھوڑی دیر میں بھاری پردہ اٹھا اور بجلی سی لہرا کر رہ گئی۔ پھر ایک پیلے سوکھے مارے جو بیس پچیس سال کے مرد نے ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا اور دہرا ہو کر سلام کیا۔ لڑکی کھس کھس کر کے ہنسنے لگی۔ مرد نے دھیرے سے اسے ڈانٹ کر پوچھا۔ ”تو نے سلام کری گے؟“

وہ بے باکی سے بولی ”میں کائے کو کروں؟ کیا میرے کو اناام بٹا کی جھک جھک کو سلام ٹھونکوں؟“ پھر کھن کھناتی ہنسی کے ساتھ بولی ”چپ کے چپ!“

مرد ڈر کے مارے ساری جان سے پیلا پڑ گیا۔ مگر نواب کو یہ شوخی لے ڈوبی۔ مسکرا کر بولے ”انعام بھی مل جائے گا۔“ اور جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہوں نے اسے کھا ڈالا۔

تفصیل سن کر نواب صاحب کو پتہ چلا کہ دھان کی فصل کی کٹائی کے بعد روز مزدوری کرنے والوں کی کھیپ کی کھیپ جو ہر سال بیکار ہو کر اضلاع سے حیدر آباد کن کارخ کرتی ہے، ان ہی میں یہ جوڑا بھی آیا ہے۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہے جو نصیبوں سے فصل اچھی ہو یا بری، سداً تحت زدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے۔

مرد اب اس بات کا طلب گار تھا کہ پھوٹی موٹی زمین کا ایک ٹکڑا

اسے گاؤں میں نواب بدایار جنگ کی جاگیر سے عطا کر دیا جائے۔ اور چونکہ زیور نگینا رہن رکھنے کے لئے کچھ پاس ہے نہیں۔ اس لئے زمین کے عوض سال بھر کے لئے اس کی جو رو کو غلامی میں لے لیا جائے۔ یعنی محل میں اس سے جھاڑو لگوائی جائے، یا پودوں میں پانی ڈلوایا جائے۔ یا چاول کھائے جائیں یا مرج مسالہ پسوایا جائے۔ سال بھر کی آمدنی سے پھر دسے سرے سے اپنی زندگی شروع کرے گا۔

نواب صاحب نے ذرا چلنبھ سے پوچھا ”میاں خالی زمین کا ٹکڑا لے کو تم چاہیں گے کیا؟“

”جی نہیں حضور۔“ وہ ہاتھ ملتا ہوا بولا۔ ”میں ترکاریاں بولیوں گا حضور کو شاید نہیں معلوم کہ بھنڈی کی فصل بہت جلدی جلدی اُترتی۔“

”ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ناکہ دونوں مرد جو رد ادھر چ کوئی کام کر لیں۔“ وہ معذرت کے لہجے میں بولا۔ ”نہیں حضور مرد آدمی ہوں۔ کبھی ایسا گھردار کا کام میں نہیں کرا، کی روٹیاں تھوپ لیتا بیٹھا۔ یا مرجی کوٹ لیتا بیٹھا۔ میرے کو تو سرکار باہر کے کام اچ اچھے لگتے۔ ہور سرکار اصل بات یہ کی عمر بھر سے کھیتوں میں کام کرنے کی عادت پڑی وی ہے۔“

”بیچ میں وہ پٹا خد بول پڑی۔“ مرد ذات گھر کے اندر کاماں کریں گا تو کیسا لگیں گا؟“ اور ساتھ ہی کھس کھس کر کے زور زور سے ہنسنے بھی لگی۔ ”سرکار مردوے تو دھڑم دھڑم کاماں کرتے اچ بھلے لگتے۔“ اور اس نے بڑے غرور اور پیار سے اپنے مرد کی طرف دیکھا۔ اچانک اس کے لہجے میں غم سمٹ آیا۔ ”ابھی تھوڑے دن پہلے دیکھتے سرکار اس کو۔ ایسا موٹا کٹا

تھا کہ پوچھو نہ کو۔ شیر حیاتا ڈر کو پیچھے ہٹ جانا، پیڑنے نیٹس ہٹنا۔ اب کھانے کو نیٹس تو کیسا سو کا پڑ گیا۔“

مرد کے کاٹو تو بدن میں شاید ہی دو چار قطرے خون نکل پاتے، جو غفلت اور بے جگرہوں پر جانے آنے کا ذرا عادی ہو وہ تہذیب آداب سے بھی کچھ واقف ہو۔ وہ تو کئی بار بڑی بڑی ڈیوڑھیوں حویلیوں میں ہو آیا تھا، اسی سے پتہ تھا کہ صدر دروازے سے داخل ہوئے بعد آنکھوں کا کام صرف زمین دیکھتے رہنا ہے۔ اس کمبخت نے کبھی ایسی جگہ قدم رکھا ہی نہیں تو جانتی بھی کیسے کہ بڑے لوگوں سے بات کرنے کے بھی چند آداب ہوتے ہیں، یہ نہیں کہ اپنے ساتھ کام کرنے والیوں کی طرح آداب حضور کو سمجھ لیا اور لگی ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے۔ مگر اس وقت تو اس کی اتنی ہمت بھی نہیں ہو پار ہی تھی کہ اسے ٹوک ہی دیتا۔ لیکن اس کے خدشوں کے برخلاف نواب صاحب اس پٹاخہ کی باتوں سے بے حد محفوظ ہو رہے تھے۔

”سرکار آپ ہمارا بڑا زمین کا ٹکڑا دیو کی ہمارے سارے دلداراں دور ہو جانا۔ اچاڑ دو برس سال شادی کو ہوئے ایک سیکھ بھی نیٹس دیکھی۔“ پھر ایک ہاتھ سے اپنے گھور گھنگور بال جھلا کر جھلا ہٹ سے بولی۔ ”مہینہ بھر بھر تو سر کو تیل نصیب نیٹس ہوتا۔“

اب کی مرد بھی تاؤ کھا گیا۔ ”پاؤ بھر تیل تو ایک دفعے میں اس کے سر کو ہونا سرکار۔ اتنی دفعے بولا کی اتنے لمبے بالاں رکھ کو کیا کرتی۔ کاٹ ڈال سنتی بھی تو نیٹس۔“

وہ ناک چڑھا کر بولی۔ ”عورت کو پالے جتا حوصلہ نیٹس تھا تو

شادی کئے کو کیا رہے کنجڑے؟“ اور ایک دم ہنس پڑی۔ مرد بھی ہنسنے لگا۔ نواب صاحب کس لئے یہ سب کچھ بڑا انوکھا، بڑا عجیب، بڑا حسین سا تجربہ تھا۔ ان کی ساری زندگی بُری طرح مصروفیات کا شکار تھی۔ زمین کوڑٹ کچہری، مقدس اپنے پرایوں کے جھگڑے۔ دوسری طرف دعوتیں پارٹیاں، خاطر مدارات، رت جلے، رات گئے تک حجرے، طوائفیں، ناح گانے۔ بڑی بیگم گاؤں بسائے بیٹھی تھیں۔ اس کے بعد دو تین شادیاں ہنہ کا مزہ بدلنے کو کیں۔ جو اچھی شکل نظر میں بھری اسے داشتہ رکھ لیا۔ سارا ”حرم“ پٹا پڑا تھا۔ یہ پیار محبت، یہ نوک جھونک، جو انزل سے ابد تک کے لئے خدائے مرد عورت کو خوش ہو کر ودیعت کی ہو گی، اس کا ان کی زندگی میں دور دور پتہ نشان نہ تھا۔ ایک عجیب و غریب غماش نے ان کے سینے میں سر اُبھارا۔

”اس تن تنائی جو الی کی نوک جھونک کا شکاراگر میں ہو جاؤں۔ تو؟“

”تم اپنا نام نہیں بتائے اب تک۔“ انھوں نے لڑکی سے اچانک سوال کر ڈالا۔

”چھجو“ وہ بڑے فخر سے بولی

”چھجو؟“ نواب صاحب حیرت سے بولے۔ ”یہ کوئی نام ہوا بھی؟“

مرد حوصلہ پا کر بولا۔ ”سرکار اس کا نام تو شہ زادی ہے۔ سب لوگ ان سے پیار سے بگڑ کو چھجو کر دیئے۔“

”سب نہیں اکیلا (اکیلا) تو اچ بگاڑا۔“ وہ پھر لڑائی مول لینے بڑل گئی۔

مرد کے چہرے پر وہ پیار بھری خجالت چھا گئی۔ جو صرف ایک مرد کو

ہی جھپتی ہے — جیسے زیر ہو کر بولا — ”سرکار آپ اس کی باتاں پوچھ کر
نکودید۔“

(کان میں دینا بھی نہیں چاہتا، کیونکہ میں دل سے چکا ہوں۔) نواب
صاحب نے ہڑ بڑا کر مختار عام سے کہا۔ ”دل شاد پور کی نہری پانی دالی زمین
کا وہ بڑا کھیت — کیا نام ہے میاں تمہارا؟“
”جی سرکار — عزیز۔“

”ہاں، انوں عزیز میاں کو درلودیو، بیچ وغیرہ کے واسطے ادھر سے
سنوار پے بھی درلودیو۔“

عزیز بے ہوش ہوتے ہوتے بچا، لیکن اگر اسے پتہ ہوتا کہ نواب ہدیار
جنگ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اگر وہ جانتا کہ ان کے پرکھوں نے
کبھی کسی سائل کو سفید دھات یعنی چاندی تک خیرات میں نہ دی، جب دیا
سونے کا سکہ ہی دیا۔ تو شاید اسے اتنی حیرت نہ ہوتی۔ ہر سال کی طرح امسال
بھی جتنے گاؤں اور اضلاع سے دیہاتی آئے تھے ڈیڑھ می میں کھپ گئے۔
ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی۔ بچے بھی، مردوں میں سے کوئی خان ساما
کی مدد کو لگ گیا۔ کسی نے جھاڑ فانوس کی صفائی اپنالی، جتنی بڑی ڈیڑھ
لتنے ہی پھیلے ہوئے کام۔ عورتوں میں سے کچھ پاشا لوگوں اور صاحب
زادیوں کے ذاتی کاموں پر لگائی گئیں۔ چند باورچی خانوں میں، مسئلے
مرچ، سنہری، ترکاری بنانے پر جٹ گئیں۔ کوئی نواب صاحب کا حقہ
بھرنے پر، کوئی ان کے پیر دبانے پر، کوئی اکھیں جگانے پر، کوئی سسلانے پر
مامور ہوئی۔ جاموں کی طرح سب کی سب گردش میں آ گئیں۔

لیکن شہزادی نہ تو ساقی بنی نہ جام۔ نواب صاحب نے زمان خانے میں حکم بھجوا دیا تھا کہ شہزادی عرف چھوٹا نام کی ایک لڑکی کو کسی سے متعلق نہ کیا جائے۔ وہ کھاتی پیتی، مزے میں دند ناتی ساری ڈیوڑھی میں ہرنی بنی پھرتی۔

سر سر کرتے اتنے سارے دن نکل گئے۔ نواب صاحب کن حالوں کو پہنچ گئے، کہی کو اس کی خبر نہ تھی۔ بڑی نوابن کے لمبے لمبے اخبار ملاحظہ آتے پڑے سڑتے رہتے، وہ انہیں چھو کر بھی نہ دیکھتے۔ مجرے، رت بھگے ناچ گانوں کی محفلیں جیسے سب ساتھ چھوڑ گئیں۔ بس جان بوجھ کر خود کو کاموں میں غرق کئے رہتے۔ زنانے میں بھی کم ہی جلتے۔ اتنے دن بعد ایک بار کسی کام سے گئے۔ بیچ کا دروازہ اندر سے بند تھا، اس لئے نوکر خانے سے ہوتے ہوئے گئے۔ سامنے ”پرچھتی“ میں شہزادی کھڑی نہا کر بال سکھا رہی تھی۔ انہیں ایسا لگا کہ ان کی آنکھوں کی بنیائی زائل ہو جائے گی۔ جسم سچ پچ کا پنخ بن کر، جھل جھلارہا تھا کم بخت کا۔ بالوں میں وہ سیاہی پیدا ہو گئی تھی کہ ان کے اپنے نصیب کی سیاہی بھی ماند تھی۔ پیٹ بھر کھانا۔ کام نہ فکر، کھلی ہوا۔ وہ روپ نکھرا تھا کہ تنہا ہوا گوشت آپ آپ تڑ تڑ بول رہا تھا۔ وہ جیسے بغیر کسی بندش کے خود کو آزمائے جا رہے تھے۔ ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔“

چھٹے مہینے عزیز آیا۔ کوئی دیکھتا تو نہ پہچان پاتا کہ یہ وہی چھ ماہ پہلے کا سوکھا مارا سڑل چوڑہ ہے۔ جواب یوں اکیلے مرغ کی طرح سینے

کوتانے اکڑا اکڑا پھرتا ہے۔ وہ اور چھتو دونوں آزاد پرندوں کی طرح
چونچ میں چونچ ڈالے اس حوض کی منڈیر پر بیٹھے چہلیں کر رہے تھے، جو
نواب صاحب کی خوابگاہ کے نیچے دلے باغ میں تھا۔

”تو کتنا خوبصورت ہو گیا رہے۔“ چھتو بے حد بے تکلفی سے بولی
”ہو رہا تو تو سونے چاندی کے جیسی جھل جھلار رہا۔ ہاتھ لگانے
کو ڈر لگ رہا کی میلی ہو جائیں گی۔“

وہ انگوٹھا دکھا کر ہنسی۔ ”ہو رہا جیسا میں تیرے کو ہاتھ لگانے
ای تو دیوں گی نا۔“ وہ اٹھ کر بھاگنے لگی۔

عزیز نے اسے لپک کر گود میں بھر لیا۔ ”اری تیرا مرد ہوں کتنی۔“
اور یہ سب نواب صاحب نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ مرد۔ مرد۔
مرد۔

جس پھل کے پکنے کا وہ خود انتظار کر رہے تھے، ایسا پک جائے
اتنا پک جائے کہ ٹپ سے جھولی میں گر پڑے، وہ کسی اور کی جھولی میں بھی
تو گر سکتا ہے! پھر کیا کریں؟ ”مردا دیں؟“ مزہ نہیں

”نہ ہر کھلوا دیں؟“ یہ کوئی کارنامہ نہ ہوا۔

”کہیں پھنکوا دیں؟“ کوئی نئی بات نہیں

پھر۔۔۔؟ مرد۔۔۔ اس مرد کو آخر کیا کریں۔

ایک خوفناک منصوبہ ان کے ذہن میں ابھرا۔ تالی بجا کر خدمتگار
کو بلایا۔ خدمت گار مختار عام کو بلالایا۔ مختار عام کو حکم ہوا ”جراح کو
بلوایئے۔“

جراح آگیا تو پوچھا۔ ”کبھی کسی بکرے کو آپ کسی بکری کے ناخابل کئے ہیں؟“

جراح تیور دیکھ کر سب کچھ سمجھ گیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”حنور ساری عمر اسی میں گزاری ہے۔“

مگر اتنا یاد رکھو کی جان نہ جانے پائے۔“

بہت بہتر حنور۔“

مختار عام کو کھڑکی کے پاس بلا کر عزیز کا چہرہ دکھایا اور تاکید کی ”سب کا ماں پرے میں ہو رازداری کرنا۔“ جراح اُلٹے پیر سر جھکائے جھکائے واپس ہو گیا۔

تین ہفتے بعد نواب صاحب بہ نفس نفیس نوکر خانے میں تشریف لے گئے، عزیز کے ”غسل صحت“ کا حکم صادر فرمایا، بڑی معطلانی کو بلا کر میت کی کہ ایک کمرہ چنبیلی، موگرہ، موتیا، گلاب اور خوشبوؤں سے بسا دیا جائے کچے اگر اور لوہان کے پیالے بھر بھر حلائے جائیں۔ شہزادی کے لئے سرخ رنگ کا کام دار جوڑا تیار کرایا جائے۔ اور اسے دلہنوں کا ساروپ سنگھار دینے کے بعد عزیز کو ایک دو لہا کی طرح اس کے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔

ہر کام حسب حکم عالی انجام دیا گیا۔ لیکن دوسری صبح کمرے کا دروازہ جب باہر والوں نے پیٹ پیٹ کر توڑ کر کھولا تو عزیز سرخ کام دار دوپٹے کو گلے میں باندھے چھت سے لٹکا ہوا تھا۔ اور دلہن بنی شہزادی ہیوش بڑی ہوتی تھی۔

ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔ دراصل وقت ابھی تنگ نہیں آیا تھا۔ ہر کام مذہب اور شریعت کی رو سے ہونا چاہیئے۔ اس لئے عدت کی مدت ختم ہونے کا مزید انتظام کیا جائے۔ ایک نہ دو پورے تین ماہ دس دن۔ یعنی لگ بھگ کوئی چار مہینے۔ آخر خدا کو بھی تو مہنہ دکھانا ہے۔

چوتھے مہینے کے خاتمے پر۔

ساری ڈیوڑھی میں نئے سرے سے قلعی کرائی گئی۔ ملازموں کو نئی پوشاکیں بنیں۔ خواصوں، ماماؤں کنیزوں کو ایک ایک نئے جوڑے کے ساتھ ایک ایک تولہ سونے کا زیور العام میں دیا گیا۔ پوری ڈیوڑھی میں چراغاں کیا گیا۔ قالین، پردے فرنیچر بدلے گئے۔ نواب صاحب کا کمرہ جگ مگ کرنے لگا۔ دروازوں پر سانچے موتیوں کی لڑکیوں کے پردے لٹکائے گئے۔ چھتوں پر جگر مگر کم خواب کی چھت گیریاں ٹانگی گئیں۔ ایسے قالین فرش پر بچھائے گئے کہ پاؤں گھٹنوں تک دھنس جائیں۔ مایوں اور بھلاریوں کو حکم ہوا کہ ایسے سہرے اور بدھیاں گوندھیں کہ سارا حیدر آباد خوشبو سے مہک اٹھے۔ باورچیوں کو دعوت عام کے لئے موہنہ مانگی جنس دی گئی۔ ہزاروں سیرا صلی گھی، بریانی، متجن، پلاؤ، میٹھوں میں انڈیلا، جانے لگا۔ ڈیوڑھی کے کنوڑوں میں کئی سو بھیلے شکر ڈالی گئی کہ پانی شربت کی طرح میٹھا ہو جائے اور لوگ پانی کی بجائے شربت پی کر دعائیں دیں۔ اور یہ سب اس لئے ہو رہا تھا کہ نواب صاحب ایک باندی کو اپنانے جا رہے تھے۔ یہ ساری تیاریاں اور ہنگامے اور چوپختے اس لئے تھے کہ نواب

صاحب کو آج تک زندگی میں کوئی شکل اس شدت سے نہیں بھائی تھی
 ادھر ڈیوڑھی کے زنان خانے میں کئی کئی مغلا نیاں بیک وقت ایک
 شہزادی پر جتی ہوئی تھیں۔ خالص شہامتہ العبر، حنا اور گلاب کے عطر
 سے اس کے بدن کی مالش ہو رہی تھی۔ لمبے لمبے بالوں کو مٹی کی سوراخ والی
 ہنڈیا میں لوبان اور عود سے چھٹتے انرگاردوں کے دھوئیں میں بسایا جا رہا
 تھا۔ شہزادی کے لئے جو جوڑا سلا تھا اس میں پچھے یا قوت ٹانگے گئے تھے
 اور مانگ میں بھرنے کے لئے جو افشاں بنائی گئی وہ تولہ بھر پچھے ہیروں کو
 پیس کر تیار کی گئی تھی۔

رات چڑھی تو پیاس بھی بڑھی۔

پھر کوئی رات کے دس۔ گیارہ بجے، نواب صاحب بغیر نکاح
 بغیر گواہوں، بغیر وکیل، بغیر مہر، بغیر کسی پابندی کے دلہن کی خوابگاہ میں
 داخل ہو گئے کہ اس خداوند تعالیٰ نے، جس نے یہ دنیا، یہ مرد و زن بنائے
 ہیں، اسی نے صاحب جیشت مردوں پر بانڈیاں لوندیاں بھی حلال کر دی
 ہیں۔

اندر صحن میں اصلی گھی سے تر ترائی بریانی کھاتے ہوئے مالن، تمبولن
 سے بولی :

”اُجاڑ ماری کیا نصیبے والی ہے سچ پچ شہزادی بن گئی۔“